ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ

الکوثر

AL KAUTHAR

رجب المرجب تا ذی الحجۃ ۱۴۴۲ ہجری
بمطابق
فروری تا جولائی 2021ء

جامعۃ الکوثر اسلام آباد

جلد ۱ شمارہ ۱

- حرف آغاز
- جمع و تدوین قرآن
- حس سماعت میں اللہ کی نشانیاں
- اہل تشیع کے علم کلام کا تاریخی ارتقاء
- اہل تشیع کے ہاں علم تفسیر کے تاریخی ارتقاء کا ایک جائزہ
- اسلام میں حکومت کی ضرورت رسول اکرمﷺ کی نگاہ میں
- معاشرتی انصاف سیرت امیر المؤمنینؑ کی روشنی میں

بسم الله الرحمن الرحيم

ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ

الکوثر

A KAUTHAR

رجب المرجب تا ذی الحجۃ ۱۴۴۲ ہجری

محدود تعداد برائے ممبران

جلد ۱ شمارہ ۱

مدیر اعلیٰ
محمد اسحاق نجفی

مدیر
ڈاکٹر علی حسین عارف

معاون مدیر
سید وقار حیدر نقوی

مدیر (اعزازی)
سید غیور زیدی

کمپوزنگ: علی حیدری

ڈیزائنگ: عامر ندیم منیر

مجلس ادارت

- احمد حسین فخر الدین
  مسول شعبہِ علومِ قرآن و حدیث جامعۃ الکوثر اسلام آباد
- آفتاب حسین جوادی
  مسول شعبہِ تحقیق جامعۃ الکوثر اسلام آباد
- اشرف حسین اخوندزادہ
  مسول مدرسہ فاطمۃ الزہراء (جامعۃ الکوثر برانچ) نجف اشرف
- ڈاکٹر شبیر حسین داعی
  اسسٹنٹ پروفیسر محی الدین اسلامک یونیورسٹی
- ڈاکٹر ندیم عباس بلوچ
  اسسٹنٹ پروفیسر المصطفیٰ انٹر نیشنل یونیورسٹی

مجلس مشاورت

- شیخ محمد شفا نجفی
  وائس پرنسپل جامع اہلبیت اسلام آباد
- شیخ انور علی نجفی
  مسول شعبہِ فقہ و اصول جامعۃ الکوثر اسلام آباد
- محمد علی فاضل
  محقق و مترجم سابق معلم جامعۃ الکوثر اسلام آباد
- شیخ غلام محمد سلیم
  پرنسپل مدرسہ المہدی کراچی
- محی الدین کاظم
  پرنسپل مدرسہ مظہر الایمان چکوال
- محمد علی توحیدی
  محقق و مترجم جامعۃ النجف سکردو

ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مقام اشاعت: جامعۃ الکوثر H 8/2 اسلام آباد

h p://alkauthar.edu.pk/

C ntact no: 345-5143405

مقالہ نگاروں کے لئے چند ضروری ہدایات

☆ مقالے A4 سائز کے صفحہ پر، M.S Word میں بھیجیں۔ فونٹ سائز اردو زبان کے لیے جمیل یا علوی نستعلیق استعمال کریں، قرآن اور احادیث اور دیگر عربی عبارات کے لیے المصحف استعمال کریں۔ فونٹ سائز اردو میں عناوین کلیہ ۱۸ جزیئہ ۱۶ اور باقی عبارات ۱۴ ہونا ضروری ہے۔

☆ مقالہ کے شروع میں ۵۰ اسے ۲۰۰ الفاظ پر مشتمل خلاصہ (Abstract) انگریزی میں تحریر کیجیے۔

☆ مقالہ کے کلیدی الفاظ (Key words) Abstract کے بعد تحریر کیجیے۔

☆ مقالہ نگار اپنا نام، کام کی نوعیت، ادارہ، موبائل نمبر، E.mail اور اپنے دستخط کے ساتھ تاریخ روانگی بھی تحریر کریں۔

☆ مقالات، متعلقہ مضامین کے ماہرین کی منظوری کے بعد ہی قابل اشاعت قرار پائیں گے

☆ مقالہ مکمل تحقیقی، علمی، اور غیر مطبوعہ ہو۔

☆ مقالہ بنیادی اسلامی عقائد سے متصادم کسی مواد پر مشتمل نہ ہو اور نہ ہی اس میں کوئی متنازعہ مواد موجود ہو۔

☆ مقالہ کم از کم 4000 اور زیادہ سے زیادہ 7000 الفاظ پر مشتمل ہو۔

☆ مقالات کے ریفرنس اور کتابیات کے لئے مقالہ کے آخر میں Endnotes کی صورت میں Chicago Manual of References Style کے مطابق لکھے جائیں۔ مثلا

- **قرآن مجید کے حوالے کے لئے:** القرآن، ۲، ۱۳۳ (ترجمہ کے ماخذ کا بھی ذکر کیا جائے)
- **حدیث کے حوالے کے لئے :** کلینی، محمد بن یعقوب، *اصول کافی*، باب خامس، (تہران، دار لکتب الاسلامیہ) حدیث نمبر، / صفحہ
- **کتاب کا حوالہ:** السرخسی، محمد بن احمد، *اصول السرخسی*، تحقیق: احمد علی (بیروت: دار المعرفہ، ۱۹۹۷) ۱/ ۲۳۴
- کتاب کا مولف معلوم نہ ہونے کی صورت میں خود کتاب کا عنوان سب سے پہلے درج ہوگا۔
- **بائیو گرافی:** شیرازی، ناصر مکارم، *تفسیر نمونہ*، ج ۱، ترجمہ سید صفدر حسین نجفی، مصباح القرآن ٹرسٹ ۱۴۱۷ھ
- **علمی و تحقیقی مجلات سے حوالہ: مثلا**
- طالب علی عوان، "عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، مسلم امہ اور عالمی منظر نامہ" *ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ اسوہ جنرل فار سوشل سائنس اینڈ ہیومنٹیس*، جلد ۱، شمارہ ۱ (۲۰۲۰) ۱۶۔

☆ کتب، تحقیقی مجلات و دیگر رسائل کے نام Italicized شکل میں لکھے جائیں گے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱۔	حرف آغاز۔۔	مدیر اعلیٰ	۰۷
۲۔	جمع وتدوین قرآن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	شیخ محسن علی نجفی	۰۹
۳۔	حس سماعت میں اللہ کی نشانیاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	عبدالخالق نجفی	۴۹
۴۔	علم کلام کے ارتقاء میں علماء تشیع کا کردار (۱)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	وقار حیدر نقوی	۶۵
۵۔	اہل تشیع کے ہاں علم تفسیر کے تاریخی ارتقاء کا ایک جائزہ(۱)۔	ارشاد حسین یزدانی	۹۳
۶۔	اسلام میں حکومت کی ضرورت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں۔۔۔	سید باقر رضا رضوی	۱۲۷
۷۔	معاشرتی انصاف سیرت امیر المؤمنینؑ کی روشنی میں۔۔	محمد عباس کمیلی	۱۴۶

حرفِ آغاز

قرآنِ مجید وہ لافانی کتاب ہے جو دینِ خدا کے تابع انجام پانے والے ہر عمل میں ہمیں تفکر وتدّبر سے کام لینے کی تلقین کرتی ہے۔ جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے واردانِ میدان علم و حکمت کے حوالے سے جو اسلوبِ تفکر وتدبر استعمال فرمایا ہے۔ وہی انداز کار مکتب تشیع کا طرۂ امتیاز بھی ہے ایسے میں درِ شہر علم کی چوکھٹ پر جبینِ نیاز جھکائے ہلال ماہِ رجب المرجب ہر سال ہمیں علمی و تحقیقی میدان میں اک نئی جہت سے سرگرمِ عمل ہونے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ نجف اشرف میں مقیم جامعۃ الکوثر کے فارغ التحصیل طلباء اور جامعۃ الکوثر اسلام آباد میں زیر تعلیم طلاب نے علمی و تحقیقی عمل کو منظم انداز میں شروع کرتے ہوئے بہت کم وقت میں اپنی علمی و تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور اسی ماہِ رجب المرجب کی بابرکت ساعتوں میں دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ علمی و تحقیقی موضوعات پر مشتمل مقالہ جات کو شائع کرنے کا عزم بالجزم کیا پس ششماہی مجلہ الکوثر کا اجراء اسی مقصدِ وحید کی جانب اٹھنے والا پہلا قدم ہے۔

یوں تو دین اسلام کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک قرآن مجید کی عظمت واصالت مسلمہ ہے تاہم اس کی جمع آوری ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔ ششماہی مجلّہ الکوثر کا یہ اعزاز ہے کہ وہ اپنے اشاعتی سفر کا آغاز اس اہم موضوع پر مشتمل ایک قابل قدر اور فکر انگیز مقالے جمع وتدوین قرآن سے کر رہا ہے

دورِ حاضر میں قرآنِ مجید کی تعلیمات اور ارشادات نبوی کو سائنس کی روشنی میں دیکھنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے چنانچہ عامۃ الناس بالخصوص نوجوانوں کو دینِ اسلام سے قریب کرنے کے لئے اس موضوع پر غور وخوض اور تحقیق کی از بس ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حسِ سماعت کے بغیر پیکرِ انسانی نامکمل ہے اور اس عضو انسانی کا پیچیدہ اندازِ کار یقیناً اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں شامل مقالہ بعنوان ''حسِ سماعت میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں،، علمی و تحقیقی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔

علمِ کلام کی انسانی زندگی میں جو اہمیت ہے اسکے باوصف مکتب تشیع میں اس علم کی ارتقائی منازل پر تحقیقی کام کی از بس ضرورت ہے اور مقالہ ''اہلِ تشیع کے علمِ کلام کا تاریخی ارتقاء،، اسی ضرورت کو پورا کرتا دکھائی دیتا ہے

علمِ تفسیر مختلف مکاتب اسلام کے نزدیک ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے جبکہ مسلمانوں کی تاریخ کے اتار چڑھاؤ میں بھی اس علم کا خاص کردار رہا ہے ''اہل تشیع کے ہاں علمِ تفسیر کے تاریخی ارتقاء کا ایک جائزہ'' نہائیت فکر انگیز اور ٹھوس تاریخی حوالہ جات کا حامل مقالہ ہے۔

دینِ اسلام رہبانیت اپنانے کی بجائے زندگی کو فعال بنانے کا حامی ہے ایسے میں حصولِ اقتدار کی جدوجہد پر تحقیق لازم ہے اور مقالہ ''اسلام میں حکومت کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں'' اسی موضوع پر تحقیق کا ثمرہ ہے۔

انسانی معاشرے کی قدر وقیمت عدل وانصاف کی مرہونِ منت ہے اور حضرت امیر المومنینؑ کا اندازِ قضاوت وعدل رائج کئے بغیر کسی بھی معاشرے میں عدل وانصاف کا فروغ ناممکن ہے ''سیرتِ امیر المومنینؑ کی روشنی میں معاشرتی انصاف کا ایک تحقیقی جائزہ'' کے زیرِ عنوان مقالہ عدل وانصاف کے متلاشی مظلومین کے لئے گویا ایک مژدہ جانفزا ہے

ہمیں امید ہے کہ درجِ بالا مقالہ جات پر مشتمل ششماہی مجلہ الکوثر کا یہ اولین شمارہ علمی و تحقیقی حلقوں میں شرفِ قبولیت حاصل کرتے ہوئے اُن کی قابل قدر توجہ کا حقدار قرار پائے گا انشاء اللہ تعالی

والسلام

مدیرِ اعلیٰ

جمع وتدوین قرآن

Compilation and Collection of the Holy Quran

الشیخ محسن علی نجفی

(رئیس جامعۃ الکوثر، اسلام آباد)

Abstract

The Holy Quran is an ever-lasting and eternal miracle revealed to the Holy Muhammad (SAW). Previously too Prophets (A.S) came with miracles to prove the truth of their being Divine Messengers of Allah, but their miracles were in material forms because they were for limited periods. However, the Holy Prophet (SAW) was the last prophet, and his Prophethood has to outlast therefore, Allah Almighty bestowed Quran (non-material miracle) to Holy Prophet (SAW). In addition, Allah Almighty kept the mandate of compilation and protection of the Quran, as the Quran says; "Do not move your tongue with it to make haste with it, surely on Us the collecting of it and the reciting of it" (75:16-17). The current study aimed at exploring the famed collection and compilation of the Holy Quran. It also discussed that who did collect and compile the Holy Quran?. The findings of many verses, traditions, and evidences clarified that the Quran, which is in our hands is the one compiled in the Prophet's (SAW) life time and it was with the people during the Prophet's (SAW) era.

Keywords: Compilation, Collection, Holy, Quran

مقدمہ

قرآن حقائق کا ایک بحر بیکراں ہے۔ ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال ہوا: کیا وجہ ہے کہ قرآن کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے نیز اس میں جس قدر غور و فکر کیا جاتا ہے، اسی قدر اس میں مزید تازگی آجاتی ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔

قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جسے رسول خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک ابدی شریعت کے ساتھ نازل کیا گیا۔ یہ دائمی سعادت کا بشارت دہندہ، ایک احسن نظام کے لیے اساس اور انسانیت کو اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کے لیے ایک درس انقلاب ہے۔ قرآن مجید کے لاتعداد پہلو ہیں اور ہر پہلو خود ایک ابدی معجزہ ہے۔ لیکن سابقہ انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے معجزوں کے برخلاف یہ ایک غیر محسوس اور معقول معجزہ ہے جو تا قیامت ''دستور زندگی، اور ضابطہ حیات ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی، اور یہ ہر قسم کی تحریف سے پاک کتاب ہے۔

اس مقالہ کو ضبط تحریر میں لانے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ یہ قرآن جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے کیا عصر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مدون ہو چکا تھا یا بعد از رحلت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتابی شکل میں مدون کیا گیا؟ جیسا کہ عام طور پر یہ نظریہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مدون نہیں تھا، البتہ بعد از رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر ابی بکر میں زید بن ثابت کی سربراہی میں صرف دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر جمع ہوا، یا اسی طرح جمع قرآن کے بارے میں اور بھی نظریات موجود ہیں۔ جب کہ آیات قرآن کریم، احادیث مبارکہ جو فضائل قرآن، تلاوت قرآن، آداب تلاوت قرآن، احکام مصحف اور دیگر موضوعات کے بارے میں وارد شدہ ہیں ان کے گہرے اور منصفانہ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عصر رسالت میں کتابی شکل میں مدون اور ہر شخص کی دسترس میں تھا۔ پس جو قرآن اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے، وہ نہ حضرت علی علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن ہے، نہ عصر ابی بکر میں جمع شدہ قرآن ہے، اور نہ حضرت عثمان کا جمع کردہ قرآن ہے، بلکہ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن موجود ہے، وہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تدوین شدہ قرآن ہے جو کہ عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی امت کے ہاتھوں میں موجود تھا اور عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہی قرآن مختلف نسخوں میں امت کے پاس موجود رہا۔

کتابت، اسلام سے پہلے

اسلام سے پہلے عرب قوم کتابت اور تحریر وتدریس سے بالکل نابلد تھی۔ البتہ اسلام سے پہلے مکہ میں صرف ایک فرد کتابت سے واقف تھا(۱) جس کا نام حرب بن امیہ بن عبد الشمس تھا اور دوران مسافرت اس نے مکہ سے باہر جن متعدد لوگوں سے کتابت سیکھی تھی ان میں بشر بن عبد الملک صاحب دومۃ الجندل بھی شامل ہے۔ یہ شخص مکہ میں بھی آیا اور یہاں اس نے لوگوں کو کتابت سکھائی۔ چنانچہ ایک شاعر نے اس کے اس عمل کو سراہتے ہوئے کہا:

ولا تجحدوا نعماء بشر علیکمو　　　　فقد کان میمون النقیبۃ ازھرا

اتاکم بخط الجزم حتی حفظتمو　　　　من المال ما قد کان شتی مبعثرا (۲)

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت مکہ میں سترہ افراد کتابت جانتے تھے۔

کتابت، اسلام کے بعد: کتابت چونکہ حصول علم کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسلام نے علم اور قلم کو باہم مقرون کیا۔ چنانچہ ابتدائے وحی میں جس چیز کا سب سے پہلے ذکر آیا ہے وہ قرائت، علم اور قلم ہیں: اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ، الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ۔ پڑھیے! اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ (۳) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے: اِذَا کَانَ یَوۡمُ الۡقِیَامَۃِ یُوۡزَنُ مِدَادُ الۡعُلَمَاءِ مَعَ دِمَاءِ الشُّھَدَاءِ فَیَرۡجَحُ مِدَادُ الۡعُلَمَاءِ عَلَی دِمَاءِ الشُّھَدَاءِ۔ (۴) قیامت کے دن علماء (کے قلم) کی سیاہی کا وزن شہداء کے خون کے ساتھ کیا جائے گا تو علماء (کے قلم) کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزنی ثابت ہو گی چنانچہ جنگ بدر میں ساٹھ مشرکین قیدی بنے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قیدیوں میں سے ہر ایک کا فدیہ دس مسلمانوں کو کتابت سکھانا قرار دیا اور یوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابت اور خواندگی کو آزادی کا ہم پلہ قرار دیا پس اس واقعہ سے اسلامی تمدن کی تشکیل اور اسلام اور علم کے درمیان رشتے کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے

وسائل کتابت

عصر رسالت میں تدوین کتب اور رسل ورسائل کے لیے درج ذیل اشیاء لکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں:

۱۔ العسب۔ کھجور کی چھال	۲۔ لخاف۔ سفید باریک پتھر
۳۔ رقاع۔ چمڑے کے ٹکڑے	۴۔ کتف۔ بکری کے شانوں کی ہڈی
۵۔ قتب۔ پالان کی لکڑی	۶۔ شظاظ۔ وہ لکڑی جس سے بورے کا منہ باندھتے ہیں
۷۔ اشار۔ چیرے ہوئے تختے	۸۔ قضیم۔ سفید چمڑا
۹۔ رق۔ پتلا چمڑا	۱۰۔ حریر۔ ریشمی کپڑا
۱۱۔ قراطیس۔ کاغذ	

اس وقت زیادہ تر کتابت کاغذوں اور چمڑوں پر ہوتی تھی۔ اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جاری شدہ امان نامے اور مختلف حکمرانوں کو لکھے جانے والے خطوط چمڑوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں چین کاغذ سازی میں سب سے آگے تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی کاغذ بنتا تھا جو یمن میں فروخت ہوتا تھا۔ رومی بھی کاغذ بناتے تھے جو شام میں بکتا تھا اور ایرانی بھی کاغذ تیار کرتے تھے۔ یہ عراق میں بھی ملتا تھا۔ زمانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مندرجہ بالا اشیاء پر کتابت ہوا کرتی تھی اور ان پر لکھے گئے قرآن کو صحیفہ کہتے تھے اور جب ان مختلف ٹکڑوں کو کتابی شکل میں جمع کیا جاتا تو اسے مصحف کہتے تھے اور حضرت عثمان کے دور میں غیر سرکاری مصاحف کے جلا دیے جانے کے واقعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن کاغذوں پر تحریر کیا جاتا تھا۔

مابین الدفتین

کھال سے بنی ہوئی جلد کو دف کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اہم دستاویزات ان پر لکھی جاتی تھیں پھر بعد میں کاغذ پر لکھا جانا شروع ہوا اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے چمڑے کی دو جلدوں کے درمیان باندھ دیا جاتا تھا اسی لیے ان دونوں جلدوں کو دفتین اور ان میں محفوظ کیے گئے کتابت شدہ موضوع کو مابین الدفتین کہا جاتا تھا۔ خود قرآن مجید سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صدر اسلام میں کتابت کے لیے لچکدار اشیاء موجود تھیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ۔ اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹتے ہیں۔(۵) نیز ارشاد فرمایا: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ-اور (اے رسول) اگر ہم کاغذوں پر لکھی ہوئی کوئی کتاب بھی آپ پر نازل کرتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے۔(٦) مزید فرمایا: اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ جو تم کرتے تھے ہم اسے لکھواتے رہتے تھے۔(۷)

قرآن میں کتابت قرآن کا ثبوت

یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کاتب کو بلا لیتے اور لکھنے کا حکم فرماتے اور املاء کرانے کے بعد کاتب سے فرماتے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنائے پس کاتب سنا دیتا۔ ایسے میں اس سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی اصلاح فرما دیتے۔(۸) اور مشرکین مکہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والی سورہ فرقان میں ارشاد ہوا ہے: وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۔ اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔(۹) قرآن مجید میں اس بات کی شہادت بھی ملتی ہے کہ آغاز نزول ہی سے قرآن ضبط تحریر میں آتا رہا ہے۔ چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والی سورہ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے: رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔(۱۰) اور سورہ عبس میں خود قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا: كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ، مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ہرگز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحتیں ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں ہیں۔ جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔(۱۱) مزید فرمایا: وَالطُّوْرِ، وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ، فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی ایک کشادہ ورق میں۔(۱۲)

کاتبانِ وحی

قرآن مجید ایک درمیانے حجم کی کتاب ہے جو تیئیس (۲۳) برسوں میں بتدریج قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی رہی۔ بظاہر ایک دو کاتب اس کی کتابت کے لیے کافی تھے، لیکن صاحب تاریخ دمشق نے کاتبان کی تعداد (۲۳) تیئیس بتائی ہے۔ بعض مورخین کے ہاں یہ تعداد ۴۳ یا ۴۵ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ حضرت علی (ع) اور مدنی زندگی میں حضرت زید بن ثابت کے نام سننے میں آتے ہیں اور مورخین نے جن ۴۳ یا ۴۵ افراد کے نام کاتبین وحی کے زمرے میں درج کیے ہیں، ان میں سے اکثر کے کاتب وحی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ بعض اصحابؓ جو کتابت وقراءت قرآن میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور ان میں سے کچھ کے بارے میں تو یہ بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں قرآن جمع کر لیا تھا، ان تک کے نام کاتبین وحی کی فہرست میں نہیں ملتے۔ مثلاً انس بن مالک، منذر بن عمرو، اسید بن حضر، رافع بن مالک، ابو عبیدہ بن جراح، سعد بن عبید اور ابو الدرداء وغیرھم۔ اس کی ایک توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ کاتبان وحی سے مراد وہ حضرات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لکھتے تھے۔ بالفاظ دیگر نسخہ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدوین کرنے کے لیے لکھتے تھے لہٰذا ہر قرآن لکھنے اور اسے جمع کرنے والے کو کاتب وحی نہیں کہا جاتا تھا جبکہ ایک کاتب وحی عبداللہ بن سعد بن ابی السرح مرتد ہو گیا تھا اور یہ ان چھ افراد میں شامل تھا جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا تھا کہ انہیں ہر حال میں قتل کر دیا جائے۔ مگر اس کے رضاعی بھائی نے اسے امان دلوا دی اور کاتب وحی ہونا چونکہ ایک قابل فخر مقام تھا اس لیے کچھ لوگوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنا نام بھی اس فہرست میں شامل کروا دیا۔ مثلاً معاویہ نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے صرف دو سال چھ ماہ قبل وہ مسلمانوں میں شامل ہوا، مگر اس کے باوجود ابن حجر اپنی کتاب الاصابہ میں معاویہ کو کاتبین وحی میں شامل کرتے ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ لوگوں نے یزید، ابوسفیان اور حصین بن نمیر (قاتل امام حسینؑ) کو بھی کاتبین وحی میں شامل کیا ہے۔

جمع وتدوین قرآن

قرآن کی جمع وتدوین نہایت اہمیت کا حامل مسئلہ ہے اور اس پر سیر حاصل بحث و تحقیق کی ضرورت ہے کہ قرآن قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امت کی طرف کیسے منتقل ہوا؟ کیونکہ رسالتمآبؐ کے وصال کے بعد پیش آنے والے سیاسی واجتماعی حالات نے اس حقیقت کو بھی غیر واضح کر دیا کہ قرآن کی جمع وتدوین کی کیا صورت تھی؟ ذیل میں ہم اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

لفظ جمع کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ لوح قلب میں حفظ کر لینے کو بھی "جمع" کہتے ہیں۔ چنانچہ حفاظ قرآن کو جامعین القرآن بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ آیات اور سورتوں کو بلحاظ ترتیب نزول کتابت کر کے کتابی شکل میں لانا۔
۳۔ آیات اور سورتوں کو بالترتیب کتابت کر کے کتابی صورت میں مدون کرنا۔
۴۔ متعدد قرائتوں میں سے صرف ایک قراءت پر ہی لوگوں کو متفق رکھنا۔
پہلے معنی کے مطابق قلب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قلوب آل واصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن جمع اور محفوظ تھا۔
دوسرے معنی کے مطابق عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کردہ قرآن مختلف صحیفوں میں تحریر تھا۔
تیسرے معنی کے مطابق بھی عصر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن جمع اور مدون ہوا تھا۔
چوتھے معنی کے اعتبار سے قرآن کو عصر حضرت عثمان میں ایک ہی قراءت پر مجتمع کیا گیا۔
اب ان موضوعات پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

حفظ قرآن

جمع قرآن بمعنی حفظ، عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً ہوتا رہا ہے اس میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔ البتہ ہم یاد دہانی کے لیے چند شواہد کا ذکر کرتے ہیں۔
ا۔ جمع و حفظ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ (اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔ (۱۳)
علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ان علینا جمعه و قرآنه علیك حتی تحفظه و یمكنك تلاوته فلا تخف فوت شی منه ۔ قرآن کا جمع کرنا اور آپ کو پڑھانا ہمارے ذمے ہے تاکہ آپ قرآن کی تلاوت کر سکیں لہٰذا آپ قرآن کے کسی حصے کے رہ جانے کی فکر نہ کریں۔ (۱۴)
نیز قرآن میں ارشاد ہوا: وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ ۚ وَقُلۡ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا
اور آپ پر ہونے والی اس وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں اور کہدیا کریں: میرے مالک! میرے علم میں اضافہ فرما۔ (۱۵) سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى (عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کے مکمل ہونے سے قبل ہی آیت کی تلاوت شروع کر دیتے تاکہ آیت رہ نہ جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم آپ کو پڑھائیں گے تو پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

۲۔ سینۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن محفوظ ہونے اور اس کی حفاظت اللہ تعالی کے خود اپنے ذمے لینے کے بعد دوسرا مرحلہ سینۂ رسول سے امت کے سینوں میں اس کی منتقلی کا تھا۔اس مرحلے میں تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد اقدامات فرمائے۔

الف۔حافظان قرآن کی تربیت

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کو امت کے سینوں میں منتقل کرنے کے لیے حافظان قرآن کی وسیع پیمانے پر تربیت فرمائی۔ چنانچہ عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی حافظان قرآن کی تعداد اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ نام بنام انہیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔(۱۶) بعض محققین کے مطابق عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس سے متصل زمانے میں حافظان قرآن کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اجتماعی حفظ : جو لوگ پورے قرآن کو حفظ نہیں کر سکتے تھے وہ آپس میں مل کر قرآن کو تقسیم کر لیتے اور ہر فرد چند سورتیں حفظ کر لیتا تھا اور بعد میں مل کر ختم قرآن کرتے تھے۔(۱۷)

مستشرق بلاشر حفظ قرآن اور جمع قرآن میں اشتباہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حافظان قرآن کی تعداد سات سے زیادہ نہیں تھی، حالانکہ متعدد روایات سے جامعین قرآن کی تعداد تو عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سات (ہی) معلوم ہوتی ہے، جب کہ حافظان قرآن کی تعداد تو حد وشمار سے باہر ہے۔ چنانچہ سن ۴ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی عامر کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اپنے اصحاب میں سے ستر افراد کو روانہ فرمایا تھا جو سب کے سب حافظان قرآن تھے۔ حافظان قرآن کا یہ قافلہ جب بئر معونہ کے مقام پر پہنچا تو کفار نے انہیں گھیر کر سبھی کو شہید کر دیا اور اس واقعے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ماہ تک قنوت نماز میں قاتلوں پر نفرین فرماتے رہے پس یہیں سے نماز میں قنوت بھی سنت قرار پائی اور اسی سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس حافظان قرآن کو بنی عضل و قار میں قرآن کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا۔ جب یہ لوگ رجیع کے مقام پر پہنچے تو کفار نے انہیں گھیر لیا اور شہید کر دیا۔اسی طرح غزوہ احد میں چوہتر (۷۴) مسلمان شہید ہوئے جن میں خاصی تعداد حافظان قرآن کی تھی۔

حضرت ابو بکر کے عہد حکومت میں جنگ یمامہ میں ستر (۷۰) حافظان قرآن شہید ہوئے تھے۔ جب کہ ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد چار سو تھی۔ لیکن ابن کثیر کا خیال ہے کہ یہ تعداد پانچ سو تھی۔(۱۹) بعض مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ صفین میں تیس ہزار (۳۰۰۰۰) قاریان قرآن شریک تھے۔(۲۰)

قوت حافظہ : عربوں کی قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ ساٹھ ستر بند پر مشتمل اشعار دو یا تین مرتبہ سننے کے بعد حفظ کر لیتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سادہ، غیر متمدن اور صحرائی زندگی بسر کرتے تھے نیز ان کی زندگیوں میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی

اور نہ ہی اس سادہ اور باقی دنیا سے منقطع ماحول میں ان کے اذہان میں معلومات کا کوئی اژدھام تھا اس لیے قرآن پاک جیسے پر کشش اور روح پرور کلام کا حفظ کرنا ان کے لیے نہایت آسان کام تھا۔

حافظان قرآن کا مقام : عصر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حافظان قرآن کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ چنانچہ اگر جنگ میں کوئی حافظ قرآن شہید ہو جاتا تو سب سے پہلے اسے دفن کیا جاتا تھا جبکہ نا فقط امام جماعت کے لیے قراءت قرآن معیار تھا بلکہ اس سے بھی قابل توجہ بات یہ ہے کہ حفظ قرآن کے معیار پر سالار لشکر بنایا جاتا تھا۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کو امیر لشکر بنایا تو بعض صحابہ نے تعجب کیا اور کہا کہ وہ اس نو عمری میں اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ کے اس منصب کے اہل ہونے کے اوصاف بیان فرمائے جن میں سے ایک یہ تھا کہ اسامہ کو قرآن کا ایک حصہ حفظ ہے۔(۲۱)

اسی طرح عثمان بن ابی العاص کو قرآن حفظ ہونے کی وجہ سے طائف کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔

ب۔ نماز اور قرآن

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحفظ قرآن کو یقینی بنانے کے لیے اور اسے امت کے سینوں میں محفوظ رکھنے کے لیے قراءت قرآن کو نماز کے ساتھ جو کہ دین کا ستون ہے، مربوط فرمایا۔ چنانچہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازوں میں بالعموم اور نماز تہجد کی صرف ایک رکعت میں بالخصوص سورہ بقرہ اور آل عمران جیسی طویل سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے۔(۲۲)۔ حذیفہ بن یمان کہتے ہیں کہ ایک شب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ بقرہ سے تلاوت شروع فرمائی۔ پھر سورہ نساء کی تلاوت فرمائی، پھر سورہ آل عمران کی تلاوت فرمائی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں اس قدر قرآن کی تلاوت فرماتے تھے کہ آپ کے پاؤں پر ورم آ جاتا تھا۔(۲۳) صرف نماز ہی میں نہیں بلکہ رات ہو یا دن جب بھی فرصت میسر ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی اور سواری کی پشت پر بھی تلاوت قرآن فرمایا کرتے۔(۲۴) محاذ جنگ پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بآواز بلند تلاوت قرآن فرماتے تھے۔(۲۵)

چنانچہ تلاوت قرآن کو سب سے افضل عبادت قرار دیا گیا۔

ج۔ تعلیم قرآن

زمانہ رسول میں دعوت اسلامی کے ساتھ ساتھ تعلیم قرآن کا عمل بھی نہایت اہتمام سے شروع ہوا۔ چنانچہ بیعت عقبہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصعب بن عمیر کو مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے معلم قرآن کے طور پر متعین فرمایا۔(۲۶) بخاری کی روایت کے مطابق مدینہ میں تعلیم قرآن کے لیے سب سے پہلے مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم مامور

ہوئے اور بعد میں عمار اور بلال کو تعلیم قرآن کے لیے بھیجا گیا۔(۲۷) مدینہ میں تعلیم قرآن کے عمل کو وسیع پیمانے پر آگے بڑھایا گیا اور معلم اول کے طور پر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب کرام کو بذات خود قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود نے کوفہ میں اپنے ساتھیوں سے کہا: میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ستر (۷۰) سورتیں پڑھی ہیں۔(۲۸)

عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں تشہد کی تعلیم اس طرح دیتے تھے جس طرح قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ابی بن کعب کہتے ہیں: میں مسجد میں داخل ہوا تو ایک شخص قرآن پڑھ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا: تمہیں کس نے قرآن پڑھایا؟ اس نے بتایا: خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔(۲۹)

شیخ طوسی اپنی کتاب الامالی میں لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے ستر (۷۰) سورتیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم پائیں اور باقی قرآن حضرت علی علیہ السلام سے۔(۳۰)

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے شاگردوں کو قرآن پڑھانے کے بعد ان سے سنا بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اصحاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پورا قرآن بھی ختم کیا کرتے تھے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اِقْرَأْ عَلَيَّ قال فَفَتَحْتُ سورة النساء۔۔۔ الی آخر۔ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ پس میں نے سورۂ نساء کو کھولا۔[1]

اور جب اس آیت پر پہنچا: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۢبِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا

اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔(۳۱) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور فرمایا: حسبك الآن۔ اب بس کرو۔(۳۲)

مسجد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ قاریانِ قرآن سے بھری رہتی تھی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہنا پڑتا کہ لوگو! قرآن آہستہ پڑھو تاکہ آوازوں میں اختلاط پیدا نہ ہو۔

دار القراء: مدینے میں قاریان قرآن کی تعداد میں بکثرت اضافے سے مسجد اور صفہ میں گنجائش نہ رہی تو قاریانِ قرآن مخرمہ کے گھر جمع ہونے لگے۔ چنانچہ اس گھر کا نام ہی دار القراء پڑ گیا۔ یہ تاریخ میں سب سے پہلا دار القراء ہے۔ عبادہ بن ثابت ناقل

---

(1) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم عصر رسالتمآب میں کتابی شکل میں موجود تھا ورنہ ''کھولا'' کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔

ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تعلیم نہیں دیتے تھے تو ہم میں سے کسی کو حکم فرماتے کہ دور سے آنے والوں کو تعلیم قرآن دیں۔(۳۳)آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم قرآن کو اس قدر اہمیت دی کہ عورتوں کے حق مہر بھی قرآن کی ایک یا چند سورتوں کی تعلیم قرار دی جانے لگی تھی۔

عشق قرآن : شاگردان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دلوں میں قرآن مجید نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ قرآن کی تلاوت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک واقعہ اس امر پر شاہد ہے کہ ایک جنگ میں ایک مسلمان نے ایک عورت کو اسیر بنایا جس کا شوہر موقعے پر موجود نہ تھا ایسے میں شوہر کو جب پتہ چلا تو اس نے قسم کھائی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں سے اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ چنانچہ وہ لشکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعاقب میں نکلا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک درے میں رات گزارنے کا ارادہ تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمار اور عباد بن بشر انصاری کو درے کی محافظت سونپی۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ آدھی رات عباد محافظت کریں گے اور باقی آدھی رات عمار۔ چنانچہ عمار آرام کرنے لگے اور عباد عبادت میں مشغول ہو گئے۔ وہ کافر مسلمانوں کے تعاقب میں اس درے تک پہنچ گیا اور اس نے عباد کو نماز کی حالت میں دیکھ کر ایک تیر ان کی طرف پھینکا جو ان کے جسم میں پیوست ہو گیا تب عباد نے تیر کو جسم سے نکالا اور نماز کو جاری رکھا کہ یکایک اس کافر نے ایک اور تیر پھینکا اور وہ بھی ان کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ عباد نے اسے بھی جسم سے نکالا اور نماز جاری رکھی لیکن جب تیسری بار بھی تیر لگا تو عباد نے جلدی جلدی سے رکوع و سجود کو پورا کیا اور عمار کو بیدار کیا پس ان کے بیدار ہوتے ہی کافر نے راہ فرار اختیار کی تب عمار نے اپنے ساتھی کو خون میں لت پت دیکھ کر کہا کہ مجھے شروع میں ہی بیدار کر لیتے تو عباد نے جواب دیا: میں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور اسے قطع کرنا مجھے ناگوار تھا، لیکن جب تیر پے در پے آنا شروع ہوئے تو میں نے نماز جلدی سے تمام کی اور آپ کو بیدار کیا۔ خدا کی قسم اگر حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلاف ورزی کا خوف اور قوم کی پاسبانی میں کوتاہی کا ڈر نہ ہوتا تو چاہے میری جان چلی جاتی میں سورت کی تلاوت کو قطع نہ کرتا۔(۳۴)

د۔ دقیق نظر

عمر بن عامر انصاری راوی ہے کہ حضرت عمر نے اس آیت کی تلاوت کی: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ.... (۳۵)اس میں انہوں نے الانصار کی راء کو پیش دے دیا اور الذین سے پہلے واؤ کا ذکر نہ کیا تو حضرت زید بن ثابت نے تصحیح کی اور وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ پڑھا تو حضرت عمر نے کہا: امیر المؤمنین بہتر جانتے ہیں اور کہا ابی بن کعب کو بلایا جائے۔ ابی بن کعب سے دریافت کیا تو انہوں نے واؤ کے ساتھ والذین پڑھا، تو دونوں نے ایک دوسرے کی ناک کی طرف اشارہ کیا، تب اُبی نے کہا: خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت اس وقت مجھے پڑھائی جب تو گندم بیچ رہا تھا۔(۳۶)

عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤمنین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک آیت یا سورہ سنتے تو اسے بار بار پڑھتے، پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سناتے اور تصدیق کراتے۔ چنانچہ خارجہ بن زید نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس وقت تک میں نے سترہ سورتیں یاد کر لی تھیں اور جب میں نے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پڑھیں تو آپ نے تحسین فرمائی۔(۳۷)

تدوین قرآن

کوئی کلام کسی متکلم کی طرف اس وقت ہی منسوب ہو سکتا ہے جب کلمات اور ان کی ترکیب و تنظیم اس کی طرف سے ہو اور اگر منتشر کلمات کسی طرف سے اور تنظیم و ترتیب کسی اور کی جانب سے ہو تو یہ کلام اس کا شمار ہو گا جس نے اسے ترتیب دیا ہو گا۔

بعینہ اسی طرح قرآن مجید کے کلمات بھی اللہ کی جانب سے ہیں اور ان میں موجود ترتیب و تنظیم بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، بلکہ قرآن کے معجزۂ الٰہی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن کے کلمات اور اس کی ترتیب واسلوب میں وہ ہم آہنگی ہے جو کسی بشر سے صادر ہونا ممکن نہیں۔ لیکن کس قدر مقام افسوس ہے کہ اس کے باوجود غیر شیعہ علماء فرماتے ہیں (کہ) عبد اللہ بن مسعود نے کہا: سورہ قارعہ میں العھن کی جگہ الصّوف پڑھ سکتے ہیں۔(۳۸)

اسی طرح وہ حضرت ابو بکر کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ انہوں نے کہا: جاء سکرۃ الموت بالحق کی جگہ جاء سکرۃ الحق بالموت پڑھ سکتے ہیں۔(۳۹)

یا طعام الاثیم کی جگہ طعام الفاجر پڑھا جا سکتا ہے۔(۴۰)

یہاں تک کہ مؤلف کتاب المصنف نے جلد ۱۱ کے ص ۲۱۹ پر یہ تک کہہ دیا کہ بغرض وضاحت کلمات قرآن تبدیل کرنا جائز ہے۔

ترتیب آیات

قرآن کے جمع و ترتیب کے چند مراحل ہیں۔ چونکہ قرآن سورہ سورہ نازل نہیں ہوا بلکہ آیہ آیہ نازل ہوا ہے، لہٰذا جمع و ترتیب میں پہلے آیات کی ترتیب پر تحقیق کی جانی چاہیے بعد ازاں سورتوں کی ترتیب پر۔ اس بات پر نہایت قابل توجہ دلائل موجود ہیں کہ ترتیب آیات توقیفی ہے یعنی بحکم خدا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے آیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور پھر یہ کہ یہی ترتیب بہ تواتر ہم تک پہنچی ہے:

ا۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتبانِ وحی کو صرف آیات کی کتابت کا ہی حکم نہیں دیتے تھے بلکہ ساتھ ہی ترتیب بھی بتا دیتے تھے کہ کس آیت کو کس جگہ لکھنا ہے۔

چنانچہ ابن عباس راوی ہیں: کان جبرئیل اذا نزل علی النبی بالوحی یقول له ضع هذه الآیة فی سورة کذا فی موضع کذا۔ جب جبرئیل وحی لے کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں مقام پر رکھیے۔(۴۱)

ابن عباس ہی سے روایت ہے: فکان اذا نزل علیه الشئ دعا من کان یکتب فیقول: ضعوا هذه الآیات فی السورة التی فیها کذا و کذا۔

جب حضورؐ پر وحی نازل ہو جاتی تو کاتب کو بلا کر فرماتے: ان آیات کو اس سورے میں رکھا جائے جس میں فلاں فلاں (چیز کا) ذکر ہے۔(۴۲)

ابن عباس اور سدی کے نزدیک سب سے آخری آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ...(۴۳) ہے مگر جبرئیلؑ یہ حکم لائے کہ اسے سورۂ بقرہ کی دوسواسّی ویں آیت کے بعد لکھا جائے۔(۴۴)

احمد بن حنبل اپنی مسند میں ایک صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں: میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی، پھر نگاہ سیدھی کر کے فرمایا: ابھی میرے پاس جبرائیل نازل ہوئے اور یہ حکم سنایا کہ میں آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی۔ (۴۵) کو اس سورے کے فلاں مقام پر رکھوں۔ چنانچہ آپ نے اس آیت کو سورۂ نحل میں آیۂ شہادت اور آیہ عہد کے درمیان ثبت کر دیا۔(۴۶)

۲۔ اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آیہ کی تعیین و تحدید کہ فلاں جملہ ایک مکمل آیہ ہے یا نہیں، توقیفی ہے۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر موقوف ہے کہ فلاں عبارت ایک مکمل آیت ہے یا نہیں۔ (لہٰذا) کسی اجتہاد اور رائے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

چنانچہ الٓمّٓ، حٰمٓ، الٓمّٓصٓ، کٓهٰیٰعٓصٓ اور طٰسٓمّٓ حروف مقطعات ہیں اور یہ سب مستقل آیت شمار ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مستقل آیہ ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صراحت موجود ہے۔ جب کہ اسی قسم کے دوسرے حروف مقطعات مثلاً الرٰ، طٰس، صٓ، قٓ اور نٓ وغیرہ مستقل آیات نہیں ہیں بلکہ یہ نص و صراحت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کی وجہ سے حٰمٓ ایک مستقل آیت ہے اور الرٰ اور طٰس مستقل آیات نہیں ہیں۔ مزید برآں طٰسٓمّٓ اور کٓهٰیٰعٓصٓ صرف ایک ایک آیت شمار ہوتی ہے، جب کہ حٰمٓ عسٓقٓ دو آیات شمار ہوتی ہیں حالانکہ یہ بھی حروف مقطعات ہی ہیں۔

۳۔ نیز اس بات پر بھی تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ نماز میں جس سورے کی بھی تلاوت ہو اسے موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا چاہیے پس اگر یہ ترتیب ملحوظ نہ رکھی جائے تو نماز باطل ہے۔

چنانچہ اگر ترتیب توقیفی نہ ہوتی تو پھر اصولاً یہ مسئلہ اجتہاد پر مبنی ہوتا۔

۴۔ قرآنی سورتوں میں آیات کی تعداد کے بارے میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بعض صراحتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ مثلاً سورۂ فاتحہ کے بارے میں کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے۔ پس عدد آیات توقیفی ہونے کی صورت میں ترتیب کا توقیفی ہونا بھی قرین عقل ہے۔

ترتیب آیات و ترتیب نزول

یہ بات ایک واضح حقیقت ہے کہ موجودہ قرآن میں آیات جس ترتیب سے درج ہیں وہ ترتیب نزولی کے مطابق نہیں ہیں کیونکہ:

ترتیب نزولی، وقت نزول کے تقاضوں کے مطابق ہے اور ترتیب قرآن، نظام قرآن کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

اس کی وضاحت کے سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ا۔ (کہ) شروع میں شوہر کی وفات کی صورت میں عورت کے لیے ایک سال کی عدت واجب تھی اور پورا سال شوہر کے گھر سے نکلنا جائز نہ تھا نیز عورت کو شوہر سے میراث میں صرف ایک سال کا خرچہ ہی ملتا تھا اور اس کا حکم اس طرح نازل ہوا تھا:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا، وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ۔

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک انہیں (نان و نفقہ سے) بہرہ مند رکھا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔(۴۸)

(لیکن) مذکورہ بالا آیت کا حکم اسی سورہ کی اس سے پیشتر آنے والی ایک آیت کے ذریعے منسوخ ہو گیا جس میں ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا

اور تم میں سے جو وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔(۴۹)

(یہاں) ترتیب نزولی کے مطابق منسوخ پہلے اور ناسخ بعد میں نازل ہوئی ہے، جب کہ موجودہ ترتیب میں ناسخ کا پہلے اور منسوخ کا بعد میں ذکر ہے۔

۲۔ ابن عباس، سدی، جبائی اور بلخی کے مطابق آیہ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔(۵۰) کے بعد کوئی فرض حکم نازل نہیں ہوا اور حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ سدی کے الفاظ یہ ہیں:

لم ینزل بعدھا حلال و لا حراما اس آیت کے بعد حلال و حرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔(۵۱)

حالانکہ یہ آیت اب سورہ مائدہ میں درج ہے اور اس کے بعد بے شمار آیات احکام موجود ہیں۔

۳۔ آیہ: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللہِ... صفاومروہ یقیناً اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔(۵۲) صلح حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں کے لیے حج کرنا ممکن ہوا، جب کہ یہ آیت سورہ بقرہ میں درج ہے جو کہ مدینے میں نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ ہے۔

۴۔ آیہ: وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللہِ... بقولے سب سے آخر میں اتری ہے اور اگر سب سے آخر میں نہیں تو اواخر میں یقیناً ہے، جب کہ اب یہ سورہ بقرہ کی ۲۸۱ ویں آیت ہے۔(۵۳)

ترتیب سورہ ہائے قرآن

گزشتہ صفحات میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کی آیات کی ترتیب عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور یہ بات بھی عیاں ہوگئی ہے کہ سورتوں کے نام اور ان کی آیات کی تعداد بھی اسی عہد بابرکت میں طے پاچکی تھی۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: و انما کان یعرف انقضاء السورۃ بنزول بسم اللہ الرحمن الرحیم ابتداء لاخری۔ کسی سورت کے ختم ہونے کا اس وقت پتہ چلتا تھا جب کسی اور سورت کی ابتدا کے لیے بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہو جاتی تھی۔(۵۴)

لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا سورہ ہائے قرآن کی ترتیب توقیفی ہے؟ یعنی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم خدا سورتوں کو ترتیب دیا ہے یا عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اصحاب نے اپنے اجتہاد سے انہیں مرتب کیا ہے؟

اس سلسلے میں ایک نظریہ تو یہ ہے کہ چونکہ عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہنوز سلسلۂ وحی جاری تھا، اس لیے قرآن کو ایک مصحف کی شکل دینا قبل از وقت تھا اور اس کام کو بعد از رسالت انجام پانا تھا۔ چنانچہ بعد میں اپنے اپنے سلیقے کے مطابق لوگوں نے سورہ ہائے قرآن کو مرتب کیا۔

اس پر مزید دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اصحاب کے پاس متعدد قرآن موجود تھے نیز ہر مصحف کی ترتیب دوسرے مصحف سے مختلف تھی اور کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا مصحف ترتیب نزول کے مطابق تھا، جب کہ دیگر اصحاب کے مصاحف اس سے مختلف تھے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب وتدوین خود عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مکمل ہوگئی تھی۔ جس طرح آیات کی ترتیب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی نگرانی میں مقرر فرمائی تھی، اسی طرح سورتوں کی ترتیب کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ متوفی ۴۳۶ھ فرماتے ہیں:

موجودہ شکل میں قرآن کی جمع آوری عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی ہوگئی تھی۔

لیکن یہ موقف اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ترتیب سورہ ہائے قرآن توقیفی نہیں ہے۔ کیونکہ سورہ ہائے قرآن کی ترتیب اور کسی سورے کے مقدم اور مؤخر ہونے میں نظم قرآن کے ساتھ ربط نہیں ہے۔ اس لیے نماز میں آیات کو موجودہ ترتیب کے ساتھ تلاوت کرنا ضروری ہے، جبکہ سورہ ہائے قرآن کو موجودہ ترتیب کے ساتھ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ کوئی مؤخر سورہ نماز میں مقدم اور مقدم سورہ مؤخر کر کے بھی دوسری رکعت میں پڑھنا درست ہے۔

جمع قرآن در عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کہا جاتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مدون نہیں تھا، البتہ بعد از رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر ابی بکر میں زید بن ثابت کی سربراہی میں صرف دو گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر جمع ہوا۔ اس نظریے پر ہم بعد میں تحقیقی نظر ڈالیں گے۔ پہلے ہم اس بات کی تحقیق کریں گے کہ کیا عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن کتابی شکل میں مدون تھا؟

اس بات پر بے شمار دلائل موجود ہیں کہ قرآن مجید عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی کتابی شکل میں مدون تھا۔ یہاں ہم ان میں سے چند ایک دلائل پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ فریضۂ الٰہی: جس طرح خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کے گزند سے بچانے کا کام خداوند عالم نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا: وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔(۵۵) بالکل اسی طرح قرآن کو جمع اور محفوظ کرنا اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لیا اور فرمایا: لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ، اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ۔ (اے رسول) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔(۵۶)

نیز یہ ارشاد الٰہی بھی ہے: سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤى (عنقریب (ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔(۵۷)

۲۔ کاتبان وحی: قرآن مجید ایک متوسط حجم کی کتاب ہے جو ۲۳ سالوں میں رسول خدا پر نازل ہوئی۔ بظاہر تو ایک دو کاتب ہی اس کی کتابت کے لیے کافی تھے مگر بعض مورخین کے ہاں اس کے کاتبوں کی تعداد چالیس تک بیان کی گئی ہے۔

جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کو اہتمام کے ساتھ بالالتزام لکھوایا کرتے تھے اور جو کچھ لکھا جاتا تھا کیا اسے ہر کاتب وحی اپنے ساتھ لے جاتا تھا؟ اور کیا قرآن متعدد کاتبان وحی کے پاس منتشر اور متفرق صورت میں موجود تھا؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قرآن مدون شکل میں موجود نہ تھا؟ یہ باتیں نہایت بعید از عقل و قیاس ہیں۔

اور کیونکہ کاتبان وحی سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کتابت کیا کرتے تھے لہٰذا ذاتی طور پر اپنے لیے کتابت قرآن کرنے والوں کو کاتبان وحی کا منصب نہیں دیا جاتا جبکہ زید بن ثابت کہتے ہیں: کنا حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نؤلف القرآن من الرقاع۔(۵۸)

ہم رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن کی جمع وتدوین کیا کرتے تھے۔

چنانچہ یہ قرآن خانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب حضرت علی (ع) کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا: یا علی القران خلف فراشی فی الصحف و الحریر و القراطیس فخذوہ و اجمعوہ و لا تضیعوہ۔اے علی(ع) قرآن میرے بستر کے عقب میں مختلف صحیفوں پر ابریشم اور کاغذوں کی صورت میں موجود ہے۔ پس اسے لے لو اور جمع کر لو اور اسے ضائع نہ ہونے دو۔ (۵۹)ابو عبد اللہ محاسبی کہتے ہیں: خانہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کچھ اوراق پائے گئے جن پر قرآن مجید تحریر تھا پس کسی نے انہیں جمع کیا اور ایک دھاگے میں سب اوراق کو پرو دیا تاکہ کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔[2]

۳۔ قرآن سے کتابت قرآن کا ثبوت: مشرکین مکہ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتبوں سے قرآن لکھوایا کرتے تھے۔

چنانچہ مکہ میں نازل ہونے والے سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا: وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا اور کہتے ہیں: (یہ قرآن) پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں جو اس شخص نے لکھوا رکھی ہیں اور جو صبح و شام اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ (۶۱) دیگر قرآنی آیات سے بھی اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ آغاز نزول قرآن سے ہی قرآن ضبط تحریر میں آنے لگا تھا۔ چنانچہ ہجرت سے سات سال قبل نازل ہونے والے سورۂ بینہ میں ارشاد ہوتا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ اللہ کی طرف سے ایک رسول جو انہیں پاک صحیفے پڑھ کر سنائے۔ (۶۲)

اور سورۂ عبس میں فرمایا گیا: كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ، مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ہر گز نہیں! یہ (آیات) یقیناً نصیحت ہیں۔ پس جو چاہے انہیں یاد رکھے۔ یہ محترم صحیفوں میں سے ہیں جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں۔ (۶۳)

اور سورۂ طور میں ارشاد الٰہی ہے: وَالطُّوْرِ، وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ، فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ قسم ہے طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی، ایک کشادہ ورق میں۔ (۶۴) قرآن کی کتابت اور تدوین آغاز وحی کے ساتھ ہی مکہ میں ہی شروع ہو جانے پر خود قرآنی شواہد کے علاوہ بے شمار تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک کاتب کو بلا کر لکھنے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ املا فرمانے کے بعد کاتب سے فرماتے: ''جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ کر سنا دے''۔ تب کاتب سنا دیتا اور اگر کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصلاح فرما دیتے۔ (۶۵) حضرت عمر نے اپنی بہن کے گھر میں دو صحیفے پائے جن پر قرآن لکھا ہوا تھا انہوں نے ان صحیفوں کو کسی سے پڑھوایا اور انہیں سن کر اسلام قبول کیا۔

---

(2) البرہان ۱ : ۲۳۸۔ ان راویوں کا شیوہ امانت فی النقل کے خلاف ہے کہ اس ہستی (علی علیہ السلام) کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جس نے قرآن کو ضائع ہونے سے بچایا ہے۔

۴۔ شیوۂ رسول: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہمراہ ایسے کاتبین رکھتے تھے جو معاہدوں اور قرض وغیرہ کو ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان کاتبوں کو حکم دیا گیا کہ صلح حدیبیہ سے قبل اسلام قبول کرنے والوں کے اسماء کا اندراج کر کے ایک فہرست مرتب کی جائے تو حضرت معاذ نے ایک ہزار پانچ سو افراد کے نام درج کیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید سے کم اہمیت والی چیزوں تک کو ضبط تحریر میں لانے اور محفوظ کرنے کا اہتمام فرماتے تھے تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ابدی معجزے کی تدوین وکتابت کا انتظام نہیں فرمایا ہوگا۔

۵۔ عصر رسول کے جامعین قرآن: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اصحاب کرام کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ قرآن مجید عصر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی جمع ہو چکا تھا چنانچہ ہم ذیل میں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام: آپ (ع) نے عہد رسالتؐ میں قرآن اپنے سینے میں حفظ کر لیا تھا اور جمع بھی کیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

۲۔ اُبی بن کعب بن قیس: آپ کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج سے تھا۔ یہ کاتب و حافظ قرآن تھے۔ ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابوالمنذر تھی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: اما نحن فنقرأ علی قراءۃ اُبی۔ ہم ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں۔ (۶۶) صحیح بخاری اور الفہرست لابن ندیم میں انہیں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۳۔ معاذ بن جبل بن اوس: یہ بھی انصار میں سے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تعلیم قرآن کے لیے یمن روانہ فرمایا تھا۔ صحیح بخاری اور فہرست میں انہیں بھی عصرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۴۔ زید بن ثابت: ان کا ہم آئندہ بھی ذکر کریں گے۔ یہ کاتب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور ان کا یہ قول مشہور ہے: کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف ٹکڑوں سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔ (۶۷) دوسرے مصادر کے علاوہ صحیح بخاری اور الفہرست، الاتقان اور مناہل العرفان میں انہیں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۵۔ عبد اللہ ابن عمر: نسائی نے صحیح سند کے ساتھ عبد اللہ بن عمر سے روایت درج کی ہے کہ انہوں نے کہا: جمعت القرآن فقرأت بہ کل لیلۃ، فبلغ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فقال: اقرأہ فی شھر۔ میں نے قرآن جمع کیا اور (میں قرآن) ہر رات کو ختم کیا کرتا تھا۔ رسول اللہ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا: ایک ماہ میں ختم کیا کرو۔ (۶۸)

۶۔ ابو ایوب انصاری: سیوطی نے الاتقان میں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۷۔ابوالدرداء: صحیح بخاری اور الفہرست میں انہیں بھی عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۸۔عبادہ بن صامت: سیوطی نے الاتقان میں انہیں عصر رسالت کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

۹۔ابو زید ثابت بن زید بن النعمان: صحیح بخاری اور الفہرست میں عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

۱۰۔سعد بن عبید انصاری: انہیں الفہرست میں جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

11۔عبید بن معاذ یا عتید بن معاذ جزری: الفہرست میں عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں ان کا ذکر ہے۔

۱۲۔مجمع بن جاریہ یا حارثہ: الاتقان اور تاریخ القرآن زنجانی میں انہیں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۱۳۔ام ورقہ بنت عبد اللہ ابن حارث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خاتون کو شہیدہ کہہ کر پکارتے تھے۔اور حضرت عمر کے عہد خلافت میں اس خاتون کو ان کے اپنے غلام اور کنیز نے ہی شہید کر دیا۔ سیوطی نے الاتقان میں انہیں جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

۱۴۔سالم مولی ابی حذیفہ: زرکشی نے البرہان میں انہیں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا ہے۔

۱۵۔عبد اللہ ابن مسعود: آپ قرآن کے جلیل القدر معلم ہیں۔عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی آپ نے قرآن جمع کیا تھا۔(۶۹)

۱۶۔عقبہ بن عامر: آپ کو البرہان میں عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار کیا گیا ہے۔

۶۔جبرائیل کا دورۂ قرآن: امامیہ، غیر امامیہ روایات سے ثابت ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال جبرئیل کے ساتھ قرآن کی بازخوانی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں: سمعنا رسول الله يقول: جبرئيل كان يعارضني بالقرآن في كل سنة مرة وانه عارضني به العام مرتين ولا اراه الا وقد حضر اجلي۔(۷۰)

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جبرئیل پہلے سال میں ایک بار میرے ساتھ قرآن کا دورہ کیا کرتے تھے لیکن اس سال دو مرتبہ کیا ہے۔اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ میرا وقت وصال قریب ہے۔ صحیح بخاری کے باب فضائل القرآن میں دورۂ قرآن کے بارے میں جناب سیدہ فاطمہ زہراء(س) کی یہی روایت اس طرح منقول

ہے: قال مسروق: عن عائشة عن فاطمة علیها السلام[3]: اسرّ الیّ النبی صلی اللہ علیه(و آله) و سلم ان جبرئیل یعارضنی بالقرآن کل سنة و انه عارضنی العام مرتین الا حضر اجلی۔ مسروق کہتے ہیں: حضرت عائشہ نے جناب فاطمہ (س) سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے فرمایا کہ جبرئیل ہر سال مجھ سے قرآن کا ایک بار دورہ (بازخوانی) کرتے ہیں مگر اس سال انہوں نے مجھ سے دوبار دورہ کیا ہے۔اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت روانگی قریب ہے۔(۷۲)

۷۔اصحاب کا عرضۂ قرآن: اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے جو حضرات قراءت قرآن میں ممتاز مقام رکھتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے تھے اور بازخوانی ہوتی تھی۔آخری بازخوانی عرضۂ اخیر یا دورہ اخیر کے نام سے مشہور ہے۔

راغب، اُبی بن کعب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ لوگوں نے ان کی قراءت کو اس لیے قبول کیا کہ وہ آخری فرد تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قرآن کی بازخوانی کی۔اسی لیے ابن عباس کہتے ہیں: میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری کلام اور عمل کو معیار قرار دے کر اسے اختیار کرتا ہوں۔

جبکہ ابن مسعود کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ بھی عرضۂ اخیر میں موجود تھے۔اس سے عرضۂ اخیر کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کو آخری شکل دے کر اسے امت کے حوالے کیا ہے۔

۸۔ختم قرآن: اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایسے افراد کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قرآن ختم کیا جبکہ وہ خود انفرادی طور پر پورا قرآن ختم کیا کرتے تھے، جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدت کا بھی تعین فرمایا کہ کتنی مدت میں قرآن کا ختم کرنا مناسب ہے۔جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن عمر سے فرمایا کہ ایک ماہ میں قرآن ختم کیا کرو۔

اس کے علاوہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤمنین اجتماعی طور پر بھی ختم قرآن کیا کرتے تھے۔یعنی قرآن کی سورتوں کو آپس میں تقسیم کرتے اور ہر فرد چند سورے پڑھ لیتا اور یوں ختم قرآن ہو جاتا۔(۷۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اصحاب، قرآن کو دس روز یا چھ روز یا کم سے کم پانچ روز میں بھی ختم کیا کرتے تھے (۷۴) پس اگر قرآن

---

[3] واضح رہے کہ صحیح بخاری میں اٹھائیس (۲۸) مقامات پر جناب سیدہ کے اسم مبارک کے ساتھ "علیہا السلام" درج ہے۔اسی طرح صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر ائمہ اھل بیت کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی "علیہ السلام" درج ہے۔لہٰذا یہ کہنا کہ صرف شیعہ ایسا کرتے ہیں، جہالت پر مبنی ہے۔

کتابی شکل میں ایک مجموعے کے طور پر لوگوں کے پاس نہ ہوتا تو صرف تلاوت کا ذکر ہو سکتا تھا، ختم قرآن کے الفاظ بے معنی ہوتے۔

جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: احب الاعمال الی اللہ الحال المرتحل۔ اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل الحال المرتحل ہے۔(۷۵) روایت ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی ایک بار پوچھا گیا کہ بہترین عمل کیا ہے ؟ تو آپ (ع) نے فرمایا: الحال المرتحل ۔ اس کی تشریح پوچھی گئی تو فرمایا: فتح القرآن و ختمه کلما جاء باولها رتحلفی آخرہ۔ قرآن کا کھولنا اور ختم کرنا۔ (پس) جب بھی قرآن کی ابتدا پر آیا، (تو میں) آخر کی طرف روانہ ہوا۔(۷۶)

شیخ طوسیؒ درج ذیل امور کو عدم تحریف قرآن کی دلیل سمجھتے تھے: ۱۔ ختم قرآن مجید کا ثواب۔ ۲۔ قرآن کو ایک رات میں ختم کرنے کی ممانعت۔

۳۔ قرآن کو کم از کم تین روز میں ختم کرنے کی ہدایت۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں: اصحاب کی ایک جماعت مثلاً عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب اور دیگر افراد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کئی بار قرآن ختم کیا تھا۔ (۷۷) اس قسم کی متعدد دیگر روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی کتابی شکل میں مدون تھا، جس کا ایک معین آغاز اور اختتام بھی تھا اور اس کے ختم کرنے کے آداب بھی بیان کیے گئے تھے۔

۹۔ فاتحۃ الکتاب: فاتحۃ الکتاب کے معنی ہیں دیباچۂ کتاب یا افتتاحیۂ کتاب۔ یہ نام عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی اس سورے کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔

☆ قرآنی سورتوں کے نام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی معین فرمایا کرتے تھے۔ مندرجہ بالا امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی ایک کتابی شکل میں مرتب تھا جس کا ایک افتتاحیہ بھی تھا۔

۱۰۔ لفظ الکتاب کا اطلاق: عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن الکتاب کے نام سے موسوم تھا اور خود قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر اسے الکتاب کہا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حدیث شریف میں بھی مجموعۂ قرآن کو الکتاب فرمایا گیا ہے۔ جبکہ حدیث ثقلین میں، جو شیعہ اور سنی دونوں طرق سے متواتر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی۔ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت۔ یہاں کتاب سے مراد یہی مجموعہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ دیر قبل حضرت علی علیہ السلام سے جو کچھ بیان فرمایا اس کے بارے میں ابو رافع بیان کرتے ہیں: ان النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلمقال فی مرضہ الذی توفی فیه لعلی: یا علی! ھذا کتاب اللہ خذہ الیك۔ رسول اللہ (ص) نے جس مرض میں آپ (ص) کا انتقال ہوا، اس میں علیؑ سے ارشاد فرمایا: یا علی! یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اسے اپنے پاس

رکھو۔(۷۸) یہاں بھی اس مجموعہ قرآن کو "کتاب" کہا گیا ہے۔اس سے بھی یہ بات واضح ہے کہ قرآن عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کتابی شکل میں مرتب ہو چکا تھا۔

۱۱۔قرآن کا دفعتاً نزول: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ(ع) نے فرمایا: اے مفضل! اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن ماہ رمضان میں عنایت فرمایا تھا مگر اس کی تبلیغ وقت کی مناسبت پر موقوف تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امر و نہی کے مواقع پر قرآن کو بیان فرمایا کرتے تھے۔پس جبرئیل صرف اسی مقصد کے لیے نازل ہوا کرتے تھے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۷۹) یعنی قرآن کو جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے۔(۸۰) ابن عباس بیان کرتے ہیں: انه انزل فی رمضان لیلة القدر جملة واحدة ثم انزل علی مواقع النجوم رسلا فی الشهور و الایام۔ قرآن ماہ رمضان میں دفعتاً نازل ہوا ہے اور اس کے بعد مختلف مواقع پر مہینوں اور دنوں میں بتدریج بھی نازل کیا گیا۔(۸۱) ان احادیث سے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصرِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک مجموعہ کی شکل میں موجود تھا۔

۱۲۔تواتر قرآن: اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ یہ قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تواتراً نسلاً بعد نسلاً ہم تک پہنچا ہے۔اور اس تواتر کے لیے ضروری ہے کہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پورا قرآن اصحاب میں سے اتنی تعداد کے پاس موجود ہو جتنی کہ تواتر کے لیے ضروری ہے۔اس سے اس نظریے کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن عصر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع ہو چکا تھا۔

۱۳۔وصیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اَلْقرآنُ خَلفَ فِرَاشِی: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ قرآن میرے بستر کے عقب میں ہے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں مروی ہے: قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی المصحف والحریر و القراطیس فخذوه واجمعوه و لا تضیعوه. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا: اے علی! قرآن میرے بستر کے پیچھے مختلف صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں پر موجود ہے (پس) آپ اسے لے جائیں اور جمع کریں اور ضائع نہ ہونے دیں۔(۸۲)

۱۴۔اصناف سورہ ہائے قرآن: تفسیر عیاشی میں سعد الاسکاف سے مروی ہے: سمعت ابا جعفر علیه السلام میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا کہ یقول: قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم: اعطیت الطوال مکان التوراة و

اعطیت المئین مکان الانجیل، و اعطیت المثانی مکان الزبور، وفضلت بالمفصل سبع و ستین سورۃ۔[4] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے توریت کی جگہ طوال، انجیل کی جگہ مئین سورتیں اور زبور کی جگہ مثانی عنایت کی گئی ہیں اور مزید مجھے سورہ ہائے مفصل جو کہ ستاسٹھ سورتیں ہیں، عطا کر کے فضیلت دی گئی۔(۸۴) یہی روایت معمولی فرق کے ساتھ اہل سنت کے ہاں بھی منقول ہے۔اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن ایک کتابی شکل میں لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھا جس کے ابواب وفصول یعنی سورتوں کی تفصیل بھی لوگوں کو معلوم تھی۔

۱۵۔ ترتیب آیات کا توقیفی ہونا: یہ بات ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہے۔یعنی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم الٰہی آیات قرآن کو اسی موجودہ ترتیب کے مطابق رکھا ہے اور اسی ترتیب سے آیات کو مرتب کرنے کا نام جمع قرآن ہے اور یہی ترتیب تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔

انصاف یہ ہے کہ صرف آیات قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں مدوّن ہو چکا تھا۔ کیونکہ آیات قرآن کو ترتیب دینا ہی جمع وتدوین قرآن ہے نیز اس کا کوئی مدعی نہیں ہو سکتا کہ آیات قرآن کی ترتیب اجتہادی ہے اور یہ کہ موجودہ ترتیب کے علاوہ کسی اور ترتیب سے قرآن کی تلاوت ہو سکتی ہے اور نظم آیات کی موجودہ حیثیت ضروری نہیں ہے۔

۱۶۔ عصر رسالت میں قرآنی نسخے: فضائل قرآن، تلاوت قرآن، آداب تلاوت قرآن، احکام مصحف اور دیگر قرآنی موضوعات کے بارے میں وارد شدہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عصر رسالت میں کتابی شکل میں مدون اور ہر شخص کی دسترس میں تھا۔الف۔ پس اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تعلموا الکتاب و تعاھدوہ و اقتنوہ۔کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کرو، اس کے ساتھ عہد باندھو اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھو۔(۸۵)

ب۔ حفظ کرنے کی نسبت قرآن مجید کو دیکھ کر تلاوت کرنے میں زیادہ ثواب ہے۔اس سلسلے میں امامیہ، غیر امامیہ کی کتب میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔

ج۔ خود قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: النظر فی المصحف عبادۃ مصحف میں دیکھنا عبادت ہے۔(۸۶)

---

(4) طوال پہلی سات طویل سورتوں کو کہتے ہیں۔ مئین سو یا زائد آیات والی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔ مثانی وہ سورتیں ہیں جو سو سے کم آیات والی ہوں۔ جب کہ مفصل آخر قرآن کی سورتوں کو کہا جاتا ہے۔

د۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے علاقوں میں قرآن مجید ہمراہ لے جانے سے منع فرمایا۔ ان کے علاوہ بیسیوں ایسی احادیث اور احکام موجود ہیں جو عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن کے کتابی شکل میں موجود ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

جمع قرآن بعد از رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد عصر ابی بکر میں جو جمع قرآن مشہور ہے، اس کے بارے میں ہم ارباب نظر اور صاحبان تحقیق کی خدمت میں چند حقائق پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ صرف یقینی دلائل نے ہمیں ان حقائق کو پیش کرنے پر مجبور کیا ہے۔ لہٰذا امید ہے کہ تحقیقی ذوق اور مایۂ علمی رکھنے والے حضرات اس کی قدر کریں گے اور مذہبی تنگ نظری کی بنیاد پر ان حقائق کو مسترد نہیں کریں گے۔ سب سے پہلے ہم وہ مشہور قصہ بیان کرتے ہیں جس کا تذکرہ اسی سلسلے میں کیا جاتا ہے: کہا جاتا ہے کہ جنگ یمامہ میں متعدد قاریان قرآن کی شہادت کے بعد حضرت عمر نے حضرت ابو بکر سے کہا: اے ابو بکر! اس جنگ میں بہت سے قاریان قرآن شہید ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دیگر جنگوں میں بھی یہی ہوتا رہا تو قرآن کا ایک معتدبہ حصہ ضائع ہو جائے گا۔(۸۷) چنانچہ حضرت عمر نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار تاکید کی کہ ہمیں قرآن کو جمع کرنا چاہیے۔ خود حضرت ابو بکر کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی۔ (۸۸) حضرت عمر بار بار مجھ سے کہتے رہے۔ پس حضرت عمر کے اصرار پر حضرت ابو بکر نے زید بن ثابت انصاری کو بلایا اور ان سے کہا: انك رجل شابٌ عاقل لانتهمك قد کنت تکتب الوحی لرسول الله فتتبع القرآن فاجمعه۔ تم عقلمند اور قابل بھروسہ جوان ہو اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔ جاؤ قرآن کی جستجو کرو اور اسے جمع کرو۔(۸۹) زید نے ایک سوال اٹھایا اور حضرت ابو بکر سے کہا: کیف تفعلان شیئاً لم یفعله رسول الله۔ آپ وہ کام کیسے کریں گے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام نہیں دیا ہے۔[5] آخر کار زید نے اس امر کی سنگینی کے اظہار کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کیا اور ایک پچیس رکنی کمیٹی تشکیل دی اور اعلان کیا کہ جس نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کا کچھ حصہ اخذ کیا ہو وہ ہمارے پاس جمع کرائے اور جب تک اس کے قرآن ہونے پر دو گواہ پیش نہ ہوتے، وہ اسے قرآن کے طور پر قبول نہ کرتے سوائے خزیمہ بن ثابت انصاری کے کہ ان کی

---

(5) مستشرقین مثلاً نولڈکے (Noldeke) وغیرہ اسی لیے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن جمع نہیں ہوا تھا اور آپ قوم کو کوئی شے کتابی شکل میں نہیں دے کر گئے تھے۔ کیونکہ اگر قرآن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع شدہ اور کتابی شکل میں ہوتا تو ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پیش کردہ آیتوں کو بلا گواہ قبول کرتے تھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ایک گواہی کو دو گواہوں کا مرتبہ دیا تھا۔

اسی اثنا میں حضرت عمر یہ عبارت لے کر آئے: الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھا البتة نکالاً من اللہ تو زید نے حضرت عمر کی پیش کردہ عبارت کو قرآن کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ حضرت عمر کے پاس مطلوبہ گواہ موجود نہ تھے۔ (۹۱) اسی طرح زید بن ثابت نے جمع قرآن کا عمل مکمل کیا اور اس نسخے کو ایک صندوق میں یا بالفاظ روایت ایک ''ربعہ'' میں محفوظ کر لیا۔

چند حقائق: مذکورہ بالا واقعہ، جمع قرآن سے متعلقہ اہل سنت کی کتب میں بکثرت پایا جاتا ہے اور اسے ایک مسلمہ حقیقت خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس واقعے کے بارے میں چند حقائق کا ذکر ناگزیر ہے۔

ا۔ تواتر قرآن اور دو گواہ: اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ قرآن تواتر سے ثابت ہے اور اگر تواتر سے ثابت نہیں تو پھر وہ قرآن نہیں۔ پس زید نے دو گواہوں کی بنیاد پر قرآن جمع کیا اور حد تو یہ ہے کہ بعض آیات کے لیے دو گواہ بھی نہ تھے۔ چنانچہ صرف ایک گواہ کی بنیاد پر ہی بطور قرآن قبول کر لیا۔

دوسری بات جو اس سے لازم آتی ہے وہ ہے تحریف قرآن۔ کیونکہ یہاں بہت سی آیات ہیں جو دو سے زیادہ گواہوں سے ثابت ہیں، لیکن موجودہ قرآن میں ان آیات کا وجود نہیں ہے۔ مثلاً آیہ رجم، سورہ الحفد اور سورہ الخلع وغیرہ۔ پس ان کا شامل نہ کرنا جب کہ یہ بھی دو سے زائد گواہوں سے ثابت ہیں مذکورہ اسلوب کی رو سے تحریف قرآن ہے، جس کی تفصیل ہم تحریف کے موضوع میں بیان کریں گے۔

۲۔ زید بن ثابت: حضرت ابو بکر نے اس تاریخی اور نہایت اہمیت کے حامل کام کی انجام دہی کے لیے حضرت زید کو ہی کیوں منتخب کیا؟ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جن افراد کو حفظ اور قراءت قرآن میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور بقول صاحب صحیح بخاری، جن شخصیات کی طرف تعلیم قرآن کے لیے رجوع کرنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ عبد اللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل اور سالم ہیں۔ ان میں زید کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

جبکہ ابن مسعود کا مقام سب پر واضح تھا اور اُبی بن کعب کو سید القراء کہتے تھے۔ نیز معاذ بن جبل کو امام العلماء کا لقب ملا تھا۔ حضرت زید کو کتابت وحی میں شہرت رکھتے تھے مگر حفظ و قراءت میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ چنانچہ ابو وائل کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے ہمارے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں انہوں نے کہا: کیا تم مجھے زید بن ثابت کی قراءت کی پیروی کرنے کا کہتے ہو جب کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ستر سورتوں سے زائد اخذ کی ہیں جبکہ اس وقت زید بچوں کے ساتھ پھرتا تھا اور اس کے سر پر دو چوٹیاں ہوتی تھیں۔ (۹۲) البتہ زید میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہیئت حاکمہ کو ان پر اعتماد تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار خود حضرت ابو بکر نے بھی کیا کہ لا نتھمك ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے۔ اس اعتماد کی وجہ یہ

تھی کہ زید بن ثابت، انصار کا ایک فرد ہونے کے باوجود سقیفہ میں مہاجرین کے موقف کا حامی تھا۔ چنانچہ انہوں نے بروز سقیفہ اپنا سیاسی موقف ان الفاظ میں بیان کیا:

ان رسول اللہ کان من المهاجرين و كنّا انصاره و انما یکون الامام من المهاجرين و نحن انصاره۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہاجرین میں سے تھے اور ہم ان کے انصار تھے اور آج امام بھی مہاجرین میں سے ہوگا اور ہم ان کے انصار ہوں گے۔(۹۳) شاید اسی سیاسی موقف کا اثر تھا کہ یہ نہایت ثروت مند ہوگئے اور اپنے پیچھے دیگر مال و دولت کے علاوہ ایک لاکھ دینار مالیت کا سونا اور چاندی بھی چھوڑا، جو کلہاڑے سے کاٹ کر تقسیم کیا گیا۔(۹۴)

۳۔ دیگر قرآنی نسخے: سب سے اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ضیاع قرآن کا کوئی خطرہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کیونکہ اس وقت قرآن کے متعدد قابل توجہ نسخے امت کے ہاتھوں میں موجود تھے۔ چنانچہ ابن اثیر کہتے ہیں: دمشق میں اُبی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف موجود تھا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو اپنے اپنے قرآنی نسخوں کے نام بھی تجویز کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود کے مصحف کو دیباج القرآن اور ابو موسیٰ کے مصحف کو لباب القلوب کہا جاتا تھا۔(۹۵) ذیل میں ہم ان قرآنی نسخوں (مصاحف) کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضرت ابو بکر کے زمانے میں موجود تھے۔

۱۔ مصحف علی علیہ السلام: حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے: ولقد کنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه، يرفع لي في كل يوم من اخلاقه علما ويأمرني بالاقتداء به، ولقد كان يجاور في كل سنة بحراء فأراه ولا يراه غيري، ولم يجمع بيت واحد يومئذ في الاسلام غير رسول الله و خديجة و انا ثالثهما، ارى نور الوحي و الرسالة، و اشم ريح النبوة، ولقد سمعت رنة الشيطان حين نزل الوحي عليه صلى الله عليه وآله وسلم فقلت: يا رسول الله ماهذه الرنة فقال: هذا الشيطان قد أيس من عبادته، انك تسمع ما اسمع و ترى ما أرى الا انك لست بنبي و لكنك وزيرٌ و انك لعلى خير۔

اور میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ پس آپ ہر روز میرے لیے اخلاق حسنہ کے پرچم بلند فرماتے تھے اور مجھے ان کی پیروی کا حکم دیتے تھے اور ہر سال کچھ عرصے کے لیے (غار) حرا میں قیام فرماتے تھے۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا تھا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور (ام المؤمنین) خدیجہ (س) کے گھر کے علاوہ کسی گھر کی چاردیواری میں اسلام نہ تھا اور میں ان میں کا تیسرا تھا۔ پس میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی، جس پر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ آواز کیسی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا: یہ شیطان ہے جو اب اپنی پرستش سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علی) جو میں سنتا ہوں وہ تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں وہ تم بھی دیکھتے ہو، فرق بس اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو، بلکہ میرے وزیر و

جانشین ہو اور یقیناً بھلائی کی راہ پر ہو۔(۹۶) جبیر بن مطعم کہتے ہیں: قال ابی مطعم بن عدی لنا و نحن صبیان بمکة: الا ترون حب هذا الغلام یعنی علیاً۔ لمحمد و اتباعه له دون ابیه. مکہ میں ہمارے بچپنے کی بات ہے کہ ہمارے والد نے ہم سے کہا: اس بچے (علی) کو دیکھو، اسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی محبت ہے کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر ان کی کیسی اتباع کرتا ہے۔(۹۷)

سلیمان بن اعمش راوی ہے: قال علی: ما نزلت آیة الا و انا علمت فیمن نزلت و این نزلت و علی من نزلت، ان ربی وهب لی قلبا عقولا و لسانا طلقاً. حضرت علی (ع) نے فرمایا: کوئی آیت ایسی نہیں اتری مگر یہ کہ مجھے علم ہے کہ کس سلسلے میں اتری اور کہاں اتری اور کس کے بارے میں اتری۔ یقیناً میرے رب نے مجھے ایک عقلمند دل اور فصیح زبان عنایت فرمائی ہے۔(۹۸) نیز آپ (ع) نے یہ بھی فرمایا:

سلونی عن کتاب الله فانه لیس من آیة الا وقد عرفت بلیل نزلت ام بنهار أو فی سهل أو فی جبل۔ مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھ لو کیونکہ کوئی آیت ایسی نہیں کہ جسے میں نہ جانتا ہوں کہ رات کو نازل ہوئی ہے یا دن میں اور میدان میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔(۹۹) ابن مسعود کہتے ہیں: ان القرآن انزل علی سبعة احرف ما منها حرف الا وله ظهر و بطن و ان علی بن ابی طالب عنده علم الظاهر و الباطن۔ قرآن سات حروف (معانی) پر نازل ہوا ہے ان میں سے کوئی حرف ایسا نہیں جس کے لیے ایک ظاہر اور ایک باطن نہ ہو اور علی (ع) کے پاس ان حروف کے ظاہر اور باطن دونوں کا علم موجود ہے۔(۱۰۰)

وصیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: حضرت علی علیہ السلام ہی وہ واحد شخص ہیں جنہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے بارے میں وصیت فرمائی۔ اگرچہ قرآن عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں امت کے حوالے ہو چکا تھا اور پورا قرآن امت کے پاس موجود تھا لیکن اس کا محمدی نسخہ بیت مصطفی میں محفوظ تھا اور اس نسخے کے وارث علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ اسی لیے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الموت میں ارشاد فرمایا: وسلم جلس علی فالفه کما انزل الله و کان به عالماً۔

اے علی! یہ کتاب خدا ہے، اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت علی (ع) اسے ایک کپڑے میں جمع کر کے اپنے گھر لے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ (ع) نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا جیسے اللہ نے اسے نازل فرمایا تھا اور آپ (ع) ہی اسے بخوبی جانتے تھے۔(۱۰۱) چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم لعلی علیه السلام: یا علی! القرآن خلف فراشی فی الصحف و الحریر و القراطیس فخذوه و اجمعوه ولا تضیعوه۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی (ع) سے فرمایا: اے علی!

قرآن میرے بستر کے پیچھے صحیفوں، ریشمی کپڑوں اور کاغذوں میں موجود ہے، آپ (ع) اسے لے جا کر جمع کر لیں اور ضائع نہ ہونے دیں۔(۱۰۲)

نسخہ محمدی کی جمع وتدوین: محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی تو علی علیہ السلام نے فرمایا: آلیتُ ان لا آخذ عَلَیّ ردائی الا لصلوٰۃ جمعۃ حتی اجمع القرآن۔ فجمعہ۔(۱۰۳) میں نے قسم کھالی ہے کہ میں نماز جمعہ کے علاوہ اپنی عبا زیب تن نہ کروں گا (گھر سے باہر نہ نکلوں گا) جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں۔ چنانچہ انہوں نے اسے جمع فرما لیا۔ اسی لیے ابن ابی الحدید کہتے ہیں: اتفق الکل علی انہ اول من جمعہ۔ (کہ) سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو سب سے پہلے علی (ع) نے جمع کیا۔(۱۰۴) اور زرقانی کہتے ہیں: واذن لا یضرنا فی ھذا البحث ان یقال: ان علیا اول من جمع القرآن بعد رسول اللہ۔ اور ہمیں اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے پہلے علی (ع) نے قرآن جمع کیا ہے۔(۱۰۵)

اس نسخہ کی انفرادیت: عکرمہ کہتے ہیں لو اجتمعت الانس و الجن علی ان یؤلفوہ ذلك التالیف ما استطاعوا اگر جن وانس جمع ہو کر اس طرح قرآن کی جمع و ترتیب کریں تو وہ نہیں کر سکتے۔(۱۰۶) ابن جزی کلبی کہتے ہیں: لو وجد مصحفہ علیہ السلام لکان فیہ علم کثیر۔ اگر مصحف علی علیہ السلام میسر آ جاتا تو ایک علم کثیر ہاتھ آ جاتا۔(۱۰۷) ابن سیرین کہتے ہیں: لو اصبت ذلك الکتاب کان فیہ علم۔ اگر یہ کتاب میسر آ جاتی تو اس میں سے علم حاصل ہو جاتا۔(۱۰۸) شیخ مفید نے کتاب الارشاد میں فرمایا: ان علیا قدم فی مصحفہ المنسوخ علی الناسخ و کتب فیہ تاویل بعض الآیات و تفسیرھا بالتفصیل۔ حضرت علی (ع) نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا تھا اور بعض آیات کی تاویل و تفسیر بھی تفصیل سے رقم کی تھی۔ چنانچہ فیض کاشانی نے کتاب الوافی میں لکھا ہے: حضرت علی (ع) نے قرآن کی تفسیر، شان نزول آیات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی املا سے لکھی تھیں۔ چنانچہ خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ولقد جئتھم بالکتاب مشتملا علی التنزیل والتاویل۔ میں ان کے پاس وہ قرآن لایا تھا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھا۔(۱۰۹) ان نصوص سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نسخہ صرف تنزیل پر منحصر نہ تھا، جیسا کہ باقی مصاحف ہیں۔ یعنی صرف قرآن کی آیات پر ہی مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں کچھ تفسیر و تاویل بھی تھی۔

پس یہ نسخہ امت کو پیش کیا گیا: جبکہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کو زرد ریشم پر تحریر فرمایا اور ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں موجود اصحاب کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: قال رسول اللہ: انی مخلف فیکم ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا، کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی، و ھذا الکتاب و انا العترۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسری میری عترت اہل بیت (ع)۔ لہٰذا یہ ہے کتاب اور میں ہوں عترت۔(۱۱۰) اس پر جواب ملا: اگر آپ (ع) کے پاس کتاب ہے تو ہمارے پاس بھی کتاب ہے۔ چنانچہ آپ (ع) حجت تمام

کر کے واپس تشریف لے گئے تو کیا یہ ممکن ہے کہ امت کے پاس قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہ ہو، اس کے باوجود اصحاب اس نسخہ محمدی کو رد کر دیں پس اگر قرآن کا کوئی نسخہ امت کے پاس موجود نہ تھا تو اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ناقابل فہم ہے اور اگر دیگر قرآنی نسخے موجود تھے تو یہ کہنا کہ قرآن زید بن ثابت نے جمع کیا، ناقابل فہم ہے۔ اگرچہ فی الواقع دونوں صورتوں میں اس نسخہ محمدی کو رد کرنا ایک المیہ ضرور ہے۔ چنانچہ زرقانی کہتے ہیں: لا ضیر فی هذا البحث ان یقال: ان علیا اول من جمع القرآن بعد رسول الله۔ اس بحث میں اس بات کے ماننے میں کوئی حرج نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے پہلے علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا ہے۔(۱۱۱) کس قدر مقام تعجب ہے کہ جس طرح مستشرقین یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع نہیں ہوا تھا، لفظ جمع، سے جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن جمع ہوا تھا، حفظ مراد لیتے ہیں۔ یعنی عصر رسول للہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن حفظ ہوا تھا، جمع نہیں ہوا تھا، بالکل اسی طرح بعض علمائے اسلام حضرت علی علیہ السلام کے جمع قرآن کے بارے میں جو روایات میں لفظ جمع آیا ہے اسے حفظ کے معنی میں لیتے ہیں۔ یعنی آپ (ع) نے سینے میں حفظ کر لیا تھا۔(۱۱۲) تاکہ یہ ثابت ہی نہ ہو سکے کہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن جمع کیا تھا اور اسے رد کیا گیا۔ ولیست هذه اول قارورة کسرت فی الاسلام، حالانکہ حضرت علی علیہ السلام نے نسخۂ محمدی کی تدوین کے بعد ایک اونٹ پر لاد کر مسجد نبوی میں اسے اصحاب کے سامنے پیش کیا تھا اور اس واقعے کو تمام مؤرخین نے لکھا ہے اور ڈاکٹر آرتھر جفری بھی مانتے ہیں کہ علی (ع) نے قرآن کی تدوین فرمائی تھی۔(۱۱۳)

سوال یہ ہے کہ یہ نسخہ اب کہاں ہے؟: تو اس کے جواب میں پوری ذمہ داری کے ساتھ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اب حضرت علی علیہ السلام کا مصحف کہاں ہے۔ لیکن ایسے کچھ نسخے محفوظ ضرور تھے یا ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے تحریر کردہ ہیں۔ چنانچہ ابن ندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں لکھا ہے: میں نے اپنے زمانے ۳۷۷ھ میں ابو یعلی حمزہ حسنی کے پاس قرآن کا ایک نسخہ دیکھا جس کے کچھ اوراق موجود نہ تھے۔ یہ قرآن حضرت علی ابن ابی طالب کے دست مبارک کا لکھا ہوا تھا اور یہ اولاد حسن میں پشت در پشت میراث میں چلا آرہا ہے۔ مقریزی کہتے ہیں: ۵۱۶ھ میں فاطمی وزیر مامون بطائحی نے ایک قرآن جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، جامع عتیق مصر میں محفوظ کر لیا۔(۱۱۴) علاوہ ازیں ترکی میں کتابخانہ آیا صوفیہ میں حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک قرآن دو جلدوں میں موجود ہے۔ نجف اشرف میں روضۂ امیر المؤمنین علیہ السلام میں ایک نسخۂ قرآن آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک عرصہ تک موجود رہا جو بعد میں ضائع ہو گیا۔(۱۱۵)

جناب زنجانی اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھتے ہیں: و رأیت فی شھر ذی الحجة سنة ۱۳۵۳ھ فی دار الکتب العلویة فی النجف الأشرف مصحفاً بالخط الکوفی کتب علی آخرہ: کتبه علی بن ابی طالب فی سنة اربعین من الھجرة، لتشابه ابی و ابو فی رسم الخط الکوفی قد یظن من لا خبرة له انه کتب علی بن ابو طالب بالواو۔

۱۳۵۳ھ کے ماہ ذی الحجۃ الحرام میں نجف اشرف کے دار الکتب العلویہ میں خط کوفی میں ایک قرآن میں نے دیکھا جس کے آخر میں تحریر تھا کہ اسے ۴۰ھ میں علی ابن ابی طالب نے لکھا۔ کوفی رسم الخط میں ابی اور ابو تقریباً ایک جیسے ہی لکھے جاتے ہیں اس لیے بے خبر لوگ اسے ابو طالب پڑھتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے مصحف کے علاوہ درج ذیل اصحاب کے مصاحف بھی لوگوں کی دسترس میں تھے۔

۲۔ سالم مولیٰ: سالم، ابو حذیفہ کی زوجہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کا شمار اصحاب صفہ میں ہوتا ہے۔ آپ کا ایک مصحف تھا۔

۳۔ ابو زید قیس بن سکن: مالک بن انس کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی قرآن جمع کیا تھا۔

۴۔ معاذ بن جبل: ان کا مصحف شام اور حمص میں شہرت رکھتا تھا۔

۵۔ ام ورقہ بنت عبداللہ: آپ نے بھی عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی قرآن جمع کر لیا تھا۔

۶۔ سعد بن عبید: یہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں شمار ہوتے ہیں۔

۷۔ اُبی بن کعب: ان کا لقب سید القراء اور کنیت ابو المنذر ہے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا شمار علمائے یہود میں ہوتا تھا اور انہیں کتب عہدین پر عبور تھا اور ان کا مصحف سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے دوسرے مصاحف سے مختلف تھا۔

۸۔ عبد اللہ بن مسعود: یہ چھٹے شخص تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی لیے انہیں سادس ستۃ یعنی چھ میں سے چھٹا کہتے تھے۔ ان کے مصحف کو بہت شہرت حاصل تھی۔

۹۔ ابو الدرداء: ان کا شمار بھی عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامعین قرآن میں ہوتا ہے۔

۱۰۔ مقداد بن اسود: ان کا قرآن حمص اور شام میں مشہور تھا۔

۱۱۔ ابو موسیٰ اشعری: ان کا مصحف بصرہ میں رائج تھا اور یہ خود بصرہ کے حاکم بھی رہ چکے تھے۔ ان کے مصحف کو لباب القلوب کہا جاتا تھا۔

۱۲۔ حضرت حفصہ بنت عمر: کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت حفصہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور انہوں نے بحکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت لیلی بنت عبد اللہ بن عبد شمس سے کتابت سیکھی تھی اس کے علاوہ انہوں نے اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔ جو اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا اور حضرت عمر کی وفات کے بعد وہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔

۱۳۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر: متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ نے بھی اپنے لیے ایک مصحف تیار کرایا تھا اور اس میں کچھ آیات دوسرے مصاحف سے مختلف تھیں۔

۱۴۔ حضرت ام سلمہ: آپ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ آپ نے خود اپنے لیے ایک مصحف تیار کیا تھا۔

۱۵۔ زید بن ثابت: ان کا مصحف اس مصحف کے علاوہ تھا جسے حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا اور اس بات کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ زید رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور آخری دورۂ قرآن میں حاضر تھے۔ لہٰذا ان کا قرآن بھی عرضۂ اخیر میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

۱۶۔ مجمع بن جاریہ: کہتے ہیں کہ ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔ انہوں نے عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا تاہم صرف دو سورتیں رہ گئیں تھیں جو انہوں نے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حفظ کیں۔

۱۷۔ عقبہ بن عامر: ان کا بھی اپنا مصحف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصحف چوتھی صدی ہجری تک موجود تھا۔

۱۸۔ عبداللہ بن عمر: ان کا شمار بھی زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن جمع کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

۱۹۔ انس بن مالک: ان کا بھی اپنا ایک مصحف تھا۔

پس یہ ہیں وہ قرآنی نسخے جو عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جمع کر لیے گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں ضیاع قرآن کا سرے سے کوئی خطرہ نہ تھا۔(۱۱۶)

اختلاف قراءت اور نسخہ

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت ابو بکر نے اپنے زمانے میں قرآن کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے زید بن ثابت سے قرآن جمع کروایا تھا تو یہ نسخہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کیوں نہ تھا؟ کیونکہ بعد میں جب عہدِ عثمان میں قراءت کا اختلاف پیدا ہوا تو اس نسخے کے معاصر دوسرے نسخوں کا ذکر آتا ہے، مگر اس نسخے کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا کہ کچھ لوگ اس مصحف کے مطابق بھی قراءت کر رہے ہوں۔ جیسا کہ دمشق میں ابی بن کعب کا مصحف، حمص میں مقداد کا مصحف، کوفہ میں ابن مسعود کا مصحف اور بصرہ میں ابو موسیٰ کا مصحف رائج تھا۔

اگر قرآن کو ضیاع سے بچانا ہی مقصود تھا اور لوگوں کے پاس قرآن محفوظ نہ تھا تو زید بن ثابت کے سرکاری نسخے کو عام کرنا چاہیے تھا، جب کہ تاریخ گواہ ہے کہ یہ نسخہ ایک صندوق میں بند رہا۔ بقول روایات ایک ربعہ میں بند کر دیا گیا۔ صرف حضرت عثمان کے دور میں ایک مرتبہ یہ نسخہ ربعہ سے نکالا گیا اور یہ نسخہ حضرت ابو بکر کے بعد حضرت عمر کے پاس آیا۔ پھر ان کی وفات کے بعد حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد مروان بن حکم والی مدینہ نے اسے جلا دیا۔(۱۱۷)

شاید یہ نسخہ تیار کروانے کی اصل وجہ یہ ہو کہ دیگر اصحاب کے علاوہ حضرت علی(ع) کے پاس تو قرآن کا ایک جامع نسخہ موجود تھا، لیکن ہیئت حاکمہ کے پاس کوئی قرآنی نسخہ موجود نہیں تھا۔

چنانچہ اس سرکاری نسخے کے بارے میں مصر کے مشہور مؤلف ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز اپنی کتاب مدخل الی القرآن الکریم ص۳۸ میں لکھتے ہیں: و لکن رغم قیمة هذا المصحف العظیمة و رغم ما یستحقه من العنایة التی بذلت فی جمعه فان مجرد بقائه محفوظاً بعنایة عند الخلیفتین الاولین اسبغ علیه الطابع الفردی اوالشخصی بعض الشیء و لم یصبح وثیقة للبشر کافة۔ اس نسخے کی بہت قدر و قیمت اور اس کے جمع کرنے پر صرف ہونے والی توجہ قابل قدر ہونے کے باوجود اس نسخے کا صرف دونوں خلفاء کے پاس محفوظ رہنے سے اس پر ذاتی اور شخصی تاثر کسی حد تک قائم رہا اور تمام لوگوں کے لیے یہ ایک دستاویز کی حیثیت حاصل نہ کر سکا(۱۱۸) ڈاکٹر محمد عبداللہ کا تبصرہ بالکل درست ہے کہ اس نسخہ کا امت کے ساتھ کوئی ربط نہ رہا اور امت کے پاس اس نسخے کے علاوہ بہت سے نسخہ ہائے قرآن موجود تھے۔

تضادات: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآن کے بارے میں جو روایات اہل سنت نے اپنی کتب میں بکثرت درج کی ہیں، ان میں اس قدر تضادات موجود ہیں کہ کسی ایک روایت پر بھی اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان تضادات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کتاب البیان فی تفسیر القرآن کا مطالعہ کافی رہے گا جہاں اس موضوع کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں جنگ یمامہ میں چار سو قاریان قرآن شہید ہونے کی وجہ سے ضیاع قرآن کا خطرہ لاحق ہوا۔ جبکہ تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ میں تین ہزار قاریان قرآن شریک تھے۔ تو بھلا ان میں سے صرف چار سو کے شہید ہونے سے قرآن کے ضیاع کا خطرہ کیسے لاحق ہو سکتا تھا؟

عصر ابو بکر میں جمع قرآن

بالفاظ دیگر سرکاری نسخہ تیار کرنے کے واقعے سے مستشرقین کو یہ موقع ملا کہ وہ یہ نظریہ قائم کریں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے وقت کوئی نسخہ قرآن امت کے ہاتھوں میں موجود نہ تھا، ورنہ حضرت عمر اور حضرت ابو بکر کو ضیاع قرآن کا خوف لاحق نہ ہوتا۔(۱۱۹)

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ ضیاع قرآن کے خوف کا کوئی سبب موجود نہ تھا اور نہ ہی سرکاری نسخے نے قرآن کا تحفظ کیا ہے۔ البتہ اس خوف کی کوئی دوسری وجوہ ہو سکتی ہیں یا پھر اس قول کی نسبت ان کی جانب درست نہیں کہ کسی خوف کا اظہار ہوا تھا۔ پس اس کا بہترین حل یہ ہے کہ زہری کی اس روایت کو غیر معتبر اور دیگر حقائق سے متصادم ہونے کی وجہ سے مسترد کیا جائے۔ چنانچہ جناب صدیق حسن خان اپنی کتاب جمع وتدوین قرآن صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے غیر معتبر ہونے کے جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ انہیں بہ یک نظر مسترد کر دیا جائے۔

عصر عثمان اور قرآن: حضرت عثمان کے زمانے میں ایک طرف تو اسلام کرۂ ارض کے ایک وسیع خطے پر پھیل گیا تھا اور غیر عرب قومیں بھی اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف قرآن کی مختلف قرائتیں رائج تھیں اور قراءت مختلف ہونے کا مطلب تلفظ میں اختلاف ہے۔ مثلاً یَطۡهُرۡنَ ایک قراءت ہے جس کا معنی ہے "پاک ہونا" جب کہ یَطَّهَّرۡنَ دوسری قراءت ہے جس کا معنی ہے "پاک کرنا"۔

حضرت حذیفہ یمانؓ

ان دنوں حضرت حذیفہ (صاحب سر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (6) آذر بائیجان میں جنگ آرمینیا میں شریک تھے جبکہ اس جنگ میں شام اور عراق کے سپاہی لڑ رہے تھے اور شام والے اُبی بن کعب کی قرائت پر قرآن پڑھتے تھے اور عراق والے ابن مسعود کی قرائت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو دوسرے کی قرائت اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اہل شام اور اہل عراق ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ اس صورت حال سے خاصے پریشان ہو گئے چنانچہ وہ آذر بائیجان سے سیدھے کوفہ آئے اور یہاں موجود اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس مسئلے کے بارے میں مشورہ کیا تب تمام اصحاب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ قرآن کی ایک ہی قرائت پر لوگوں کو مجتمع کیا جائے اور صرف عبداللہ بن مسعود نے اختلاف کیا۔(۱۲۱)

علمائے امت کا فیصلہ: حضرت حذیفہ فیصلہ لے کر مدینہ پہنچے اور گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان کے پاس حاضر ہو کر گواہی دی (کہ) میں ہی واحد پیغام لانے والا ہوں اور میں خبر دار کرتا ہوں۔ اس پر حضرت عثمان نے پوچھا: بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے فرمایا: اے خلیفہ! لوگوں کی فریاد کو پہنچو۔ حضرت عثمان نے پھر پوچھا: کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا: لوگوں نے کلام خدا میں اختلاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ پس مجھے ڈر ہے کہ مسلمانوں کا حشر بھی وہی نہ ہو جو یہود و نصاریٰ کا ہوا ہے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں: فجمع عثمان الصحابة واخبرهم الخبر، فاعظموه، ورأوا جميعا ما رأى حذيفة۔ (۱۲۲) چنانچہ حضرت عثمان نے اصحاب کو جمع کیا اور انہیں اس خبر سے آگاہ کیا۔ اصحاب نے اس کو بڑا سانحہ قرار دیا اور سب نے حذیفہ کی تائید کی۔

---

(6) حضرت حذیفہ بن یمان عراقی الاصل تھے اور سابقین فی الاسلام میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رکابدار تھے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو منافقین کی ایک جماعت تاک میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کو شہید کیا جائے، مگر اچانک بجلی چمکنے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حذیفہ نے ان سب کو دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ چنانچہ حذیفہ وہ واحد صحابی تھے جو منافقین کو جانتے تھے اسی لیے انہیں صاحب السر کہا جاتا تھا۔

کمیٹی کی تشکیل: چنانچہ اس مقصد کے لیے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ حضرت عثمان نے اس کمیٹی سے کہا:

یا اصحاب محمد اجتمعوا فاکتبوا للناس اماماً۔(۱۲۳) اے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! متفق طور پر اس امت کے لیے ایک رہنما نسخہ تیار کرو۔ ابتدائی مرحلے میں ان چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

۱۔ زید بن ثابت　۲۔ سعید بن عاص قرشی، ۳۔ عبد اللہ بن زبیر، ۴۔ عبد الرحمن بن حارث بن ہشام (۱۲۴)

زید بن ثابت اس کمیٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ تاہم اس کمیٹی کے ارکان علمی قابلیت کے فقدان کی وجہ سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے سے عاجز رہے۔ چنانچہ ایک نئی کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس میں درج ذیل افراد کو شامل کیا گیا:

۱۔ اُبی بن کعب، ۲۔ عبد اللہ بن عباس، ۳۔ انس بن مالک، ۴۔ مالک بن ابی عامر، ۵۔ کثیر بن افلح، ۶۔ مصعب بن سعد، ۷۔ عبد اللہ ابن فطیمہ (۱۲۵)

اس کمیٹی کی سربراہی اُبی بن کعب کر رہے تھے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں: انھم جمعوا القرآن من مصحف ابی بن کعب، فکان رجال یکتبون یملی علیھم ابی بن کعب۔ انہوں نے قرآن کو ابی بن کعب کے مصحف سے جمع کیا۔ چنانچہ ابی بن کعب املا کراتے تھے اور کچھ لوگ لکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے: اما نحن فَنَقْرَؤُہٗ علی قراءۃ اُبی۔ ہم بھی ابی بن کعب کی قراءت کے مطابق (قرآن) پڑھتے ہیں۔ (۱۲۶)

سرکاری مداخلت: امت کو قرآن کی کسی ایک ہی قراءت پر متحد کرنے کی تحریک حضرت حذیفہ کی جانب سے چلی اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے اتفاق کیا اور ان کی تائید کی۔ اس وقت حضرت عثمان نے اپنی مرضی کے چار افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی جو کام نہ کر سکی اور بعد میں اہل افراد سامنے آئے اور انہوں نے اس عظیم کارنامے کو بطور احسن انجام دیا۔ اس طرح وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲۷) کا الٰہی وعدہ پورا ہو گیا۔

ایک حرف کا تغیر: چنانچہ حکومت اس سلسلے میں اس حد تک بے بس ہو گئی تھی کہ ایک حرف کے تغیر و تبدل پر بھی قادر نہ تھی۔ علباء بن احمد سے روایت ہے: ان عثمان بن عفان لما اراد ان یکتب المصاحف ارادوا ان یلغوا الواو التی فی براءۃ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ... فقال لھم ابی: لتلحقنھا اولاضعن سیفی علی عاتقی فالحقوھا حضرت عثمان جب قرآن لکھوا رہے تھے تو سورہ برائت کی آیت وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ کی واؤ کو حذف کرانا چاہتے تھے مگر اُبی بن کعب[7] نے

(7) مستشرقین کا یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ کہ ابی بن کعب حضرت عمر کے دور میں وفات پا چکے تھے بلکہ تحقیق یہ ہے کہ وہ حضرت عثمان کے زمانے تک زندہ تھے اور آرمینیا کی جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

کہا: یہ واؤ رہے گی ورنہ ہم تلوار اٹھائیں گے چنانچہ اس واؤ کو رہنے دیا۔(۱۲۹) بعد میں قرآن مجید کے دیگر نسخوں کو نذر آتش کرنے پر لوگوں نے حضرت عثمان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا تو انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے خود کو اس عمل میں دوسروں کا تابع بتایا۔ ملاحظہ ہو ان کا یہ قول: و انما انا فی ذلك تابع لهؤلاء۔ میں تو اس معاملے میں صرف ان لوگوں کا تابع رہا ہوں۔(۱۳۰)

حضرت عثمان جامع قرآن نہیں ہیں: حارث محاسبی کہتے ہیں: المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان و ليس كذلك، انما حمل عثمان الناس على القراءة بوجه واحد۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ عثمان جامع قرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ عثمان نے تو لوگوں کو صرف ایک ہی قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا ہے۔(۱۳۱) قاضی ابو بکر اپنی کتاب الانتصار میں لکھتے ہیں: لم یقصد عثمان قصد ابی بکر فی جمع نفس القرآن بین لوحین، و انما قصد جمعهم علی القراءات الثابتة المعروفة عن النبی صلی الله علیه و آله وسلم والغاء ما لیس کذلك، و اخذهم بمصحف لا تقدیم فیه و لا تاخیر و لا تاویل۔(۱۳۲) حضرت عثمان نے حضرت ابو بکر کی طرح قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگوں کو ان قرائتوں پر مجتمع کیا جائے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں اور جو ثابت نہیں، انہیں متروک کیا جائے اور لوگوں کو ایسے قرآن پر مجتمع کیا جائے جس میں نہ تقدیم و تاخیر ہو اور نہ تاویل۔ چنانچہ حبیب الرحمن صدیقی مقدمہ تفسیر بیضاوی میں فرماتے ہیں: و ما اشتهر ان جامعه عثمان فهو علی ظاهره باطل لانه انما حمل الناس سنة ۳۵ھ القراءة بوجه واحد۔ اور یہ جو شہرت ہوئی ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، یہ بات بظاہر باطل ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو ۳۵ ہجری میں لوگوں کو صرف ایک قرائت اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔(۱۳۳) حضرت علی علیہ السلام کا موقف: علامہ حلی اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں: حضرت عثمان نے حضرت علی (ع) سے بھی منظوری لی تھی۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی مشہور ہے جو آپ (ع) نے دور عثمان میں لوگوں کو ایک ہی قرآن پر مجتمع کرنے کے عمل کے انجام پانے کے بعد فرمایا: لا یهاج القرآن بعد الیوم آج کے بعد قرآن کبھی مضطرب نہ ہوگا۔(۱۳۴) ایک اور مقام پر آپ (ع) نے فرمایا:

ان القرآن لا یهاج الیوم ولا یحول۔ آج قرآن کو قرار آگیا ہے اور یہ ناقابل تغیر ہو گیا ہے۔(۱۳۵) حضرت عثمان کے عہد خلافت میں جب لوگوں کو ایک مصحف پر مجتمع کرنے کی مہم چل رہی تھی تو اس وقت جناب طلحہ نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ (ع) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جو قرآن جمع کیا تھا، جسے اس قوم نے مسترد کر دیا تھا، کیا آج آپ (ع) اس قرآن کو دوبارہ پیش نہیں کر سکتے؟ تب آپ (ع) نے اس کا جواب نہ دیا۔ حالانکہ طلحہ نے ہر چند اصرار کیا مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ آخر طلحہ نے کہا: اے ابوالحسن (ع) آپ مجھے اس بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ آپ (ع) نے فرمایا: اے طلحہ! میں نے جان بوجھ کر جواب نہیں دیا تھا۔ تم خود بتاؤ کہ لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے،

کیا یہ قرآن نہیں ہے؟ کیا اس میں غیر قرآن بھی ہے؟ طلحہ نے جواب دیا کہ ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یہ سب کا سب ضرور قرآن ہے، تو آپ(ع) نے فرمایا: اگر تم نے اسی قرآن کو لے لیا تو تمہیں آتش جہنم سے نجات مل جائے گی اور جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ طلحہ نے کہا کہ اگر قرآن یہی ہے تو بس کافی ہے۔(۱۳۶)

موجودہ قرآن

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جو قرآن اس وقت امت کے ہاتھوں میں ہے، وہ:

۱۔ نہ حضرت علی علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن ہے،

۲۔ نہ عصر ابی بکر میں جمع شدہ قرآن ہے،

۳۔ نہ حضرت عثمان نے کوئی قرآن جمع کیا تھا،

بلکہ اس وقت ہمارے ہاتھوں میں جو قرآن موجود ہے، وہ عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تدوین شدہ قرآن ہے جو کہ عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی امت کے ہاتھوں میں موجود تھا اور عصر رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہی قرآن مختلف نسخوں میں امت کے پاس موجود رہا۔ یہ مختلف نسخے، جس طرح ہمارے زمانے میں چند ایک کمپنیوں کی طرف سے طبع شدہ نسخے رائج ہیں اسی طرح چند ایک اہم نسخے مختلف علاقوں میں رائج ہو گئے۔ چنانچہ:

۱۔ ابی بن کعب کا نسخہ دمشق میں

۲۔ مقداد کا نسخہ حمص میں

۳۔ عبداللہ بن مسعود کا نسخہ کوفہ میں

۴۔ ابو موسیٰ کا نسخہ بصرہ میں رائج تھا اور ان نسخوں کی قراءتیں بھی قدرے مختلف تھیں جو آگے چل کر وجہ نزاع بن گئیں۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضوان اللہ علیہ کی تحریک پر عصر عثمان میں ان تمام نسخوں کو جمع کیا گیا اور ایک قراءت پر مشتمل ایک نسخہ بنا دیا گیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

حوالہ جات

(۱) محمد، الزرقانی، مناھل العرفان فی علوم القرآن ۱: ۲۵۵۔

(۲) ابی عبداللہ، الزنجانی۔ تاریخ القرآن، ص ۳۱۔

(۳) ۹۶علق: ۳۔۴

(۴) محمد ابن علی، الصدوق، الامالی الصدوق، ص ۱۶۸۔

(۵) ۲۱انبیاء: ۱۰۴۔

(۶)۶انعام:۷۔
(۷)۴۵جاثیہ:۲۹۔
(۸)علی ابن ابی بکر، الھیثمی، مجمع الزوائد، ص۴۰۔
(۹)۲۵فرقان:۵۔
(۱۰)۹۸بینہ:۲۔
(۱۱)۸۰عبس:۱۱ تا ۱۴۔
(۱۲)۵۲طور:۱ تا ۳۔
(۱۳)۷۵قیامت:۱۶۔۱۷۔
(۱۴) فضل بن حسن، الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱۰ : ۵۰۴۔
(۱۵) ۲۰طہ:۱۱۴۔
(۱۶) ۸۷اعلیٰ:۶
(۱۷) ابوالقاسم، الخوئی، البیان فی تفسیر القرآن، ص۲۴۶۔
(۱۸) محمود، رامیار، تاریخ قرآن۔
(۱۹)اسماعیل ابن عمر، ابن کثیر، فضائل القرآن، ص۹۔
(۲۰)نصر بن مزاحم، منقری، وقعۃ صفین، ص۱۸۸۔
(۲۱) محمد، ابن سعد، الطبقات الکبیر ۱۳۶: ۲، قسم اول۔
(۲۲) محمود، رامیار، تاریخ قرآن۔
(۲۳) محمد، البخاری، صحیح البخاری: باب تہجد۔
(۲۴،۲۵) محمود، رامیار، تاریخ قرآن، ص۲۲۴ ، بحوالہ مفتاح کنوز السنۃ۔
(۲۶)عبدالرحمن، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲ :۷۶۔
(۲۷)ابی عبداللہ، الزنجانی، تاریخ القرآن۔
(۲۸) محمد، الطبری، تفسیر طبری ۱ : ۲۸۔
(۲۹)الدکتور داود، العطار، موجز علوم القرآن۔
(۳۰) محمد بن الحسن، الامالی للطوسی، ص۶۰۶۔ بحار الانوار ۸۹: ۷۔
(۳۲) ۴نساء:۴۱۔
(۳۳)میرزا حسین، مستدرک الوسائل ۴ : ۲۳۸۔ العطار، موجز علوم القرآن، ص۴۶ ۔
(۳۴)احمد بن حنبل، الشیبانی، مسند احمد بن حنبل۔
(۳۵) محمد باقر، المجلسی، حیات القلوب، ج۲ ، ص۳۸۹ اور امیار، تاریخ القرآن، ص۲۴۱۔

(۳۶) ۹توبہ:۱۰۰۔

(۳۷)ابی عبداللہ،الزنجانی۔تاریخ القرآن،ص۴۳۔

(۳۸) حوالہ سابق،ص۴۵ ۔

(۳۹)عبداللہ،ابن قتیبہ۔تاویل مشکلات القرآن،ص۱۹۔

(۴۰)محمدابن جریر،الطبری، تفسیر الطبری ۲۶ :۱۶۰۔

(۴۱)محمدابن جریر،الطبری، تفسیر الطبری ۲۶:۱۰۰۔

(۴۲،۴۳)احمد،یعقوبی،تاریخ یعقوبی ۲ :۳۶۔

(۴۴) ۲بقرہ:۲۸۱۔

(۴۵)فضل ابن حسن،الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱: ۳۹۴۔

(۴۶) ۱۶نحل:۹۰۔

(۴۷)مسند احمد بن حنبل ۴: ۲۱۸۔اسی مضمون سے قریب تر دیگر احادیث مسند احمد بن حنبل جلد اول ص۵۷۔۶۹۔ سنن ابوداؤد،ج۱ ۲۰۹،متدرک حاکم،ج۲،ص۲۲۱پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۴۸) ۲بقرۃ: ۲۴۰۔

(۴۹) ۲بقرۃ: ۲۳۴۔

(۵۰) ۵مائدہ:۳۔

(۵۱)جلال الدین،السیوطی۔الدرالمنثور فی التفسیر بالمأثور ۲ : ۲۵۹۔

(۵۲) ۲بقرۃ : ۱۵۸۔

(۵۳) ۲بقرۃ : ۲۸۱۔

(۵۴)میرزا حسین،النوری،متدرک الوسائل ۴ : ۱۶۵۔

(۵۵) ۵مائدہ:۶۷۔

(۵۶)۷۵قیامت:۱۶۔۱۷۔

(۵۷) ۸۷اعلیٰ:۶۔

(۵۸) ابی عبداللہ،الحاکم،المستدرک علی الصحیحین۔

(۵۹)بحارالانوار: کتاب القرآن۸۹ : ۴۸۔تفسیر قمی ۲ : ۴۵۱۔

(۶۱) ۲۵فرقان:۵۔

(۶۲) ۹۸بینہ : ۲۔

(۶۳) ۸۰عبس:۱۱ تا۱۴۔

(۶۴) ۵۲طور:۱ تا۳۔

(۶۵) علی بن ابی بکر، الهیثمی، مجمع الزوائد ۔
(۶۶) محمد بن یعقوب، الکلینی، اصول الکافی ۲ : ۶۳۴ وسائل الشیعہ ۶ : ۱۶۳۔ فَنَقْرَؤُہٗ کے ساتھ۔
(۶۷) جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱ : ۱۱۵۔
(۶۸) حوالہ سابق ۱ : ۱۴۴۔ محمد الزرقانی، مناھل العرفان فی علوم القرآن ۱ :۲۳۷۔
(۶۹) بدر الدین، الزرکشی، البرہان فی علوم القرآن ۱ : ۲۳۹۔
(۷۰) محمد باقر، المجلسی، بحار الانوار، الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار ۴۳ : ۵۱۔ الحسن بن ابی الحسن، الدیلمی، ارشاد القلوب ۱ : ۳۳۔ الامالی للصدوق ص ۵۹۵۔ کنز العمال ج ۱۲ حدیث ۳۴۲۔
(۷۲) محمد، البخاری، صحیح بخاری ۴ : ۱۹۱۱۔ باب کان جبرائیل یعرض القرآن۔
(۷۳) محمود، رامیار، تاریخ القرآن۔
(۷۴) حوالہ سابق۔ بحوالہ ابن سعد۔
(۷۵) ملا محسن، فیض الکشانی، المحجۃ البیضاء فی تہذیب الاحیاء ۲ : ۲۶۴۔
(۷۶) محمد بن یعقوب، الکلینی، اصول الکافی ۲ : ۶۰۵۔
(۷۷) فضل بن حسن، الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۱ : ۱۵۔
(۷۸) محمد باقر، المجلسی، بحار الانوار ۴۰ : ۱۵۵۔
(۷۹) ۷۵ قیامۃ : ۱۶۔
(۸۰) محمد باقر، المجلسی، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار ۸۹ : ۳۸۔
(۸۱) جلال الدین، السیوطی، اتقان ۱ : ۸۳۔
(۸۲) محمد باقر، المجلسی، بحار الانوار، الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار ۸۹ : ۴۸۔
(۸۴) تفسیر العیاشی، محمد بن مسعود، العیاشی ۱: ۲۵۔
(۸۵) حسن الدیلمی، اعلام الدین فی صفات المومنین ص ۱۰۰۔ اس میں اقتنوا کی جگہ افشو ہے۔
(۸۶) میرزا حسین، النوری، متدرک الوسائل ۹: ۱۵۳۔
(۸۷) محمد باقر، المجلسی، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار ۸۹: ۷۵۔
(۸۸) حوالہ سابق۔
(۸۹) حوالہ سابق۔
(۹۱) جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۱۸۔
(۹۲) سنن نسائی ۳: ۴۳۱۔ المصاحف، ص ۱۵۔
(۹۳) ابن عساکر، تہذیب تاریخ ابن عساکر، علی بن الحسن ۵: ۴۴۶۔
(۹۴) علی، المسعودی مروج الذہب و معادن الجوہر۔

(۹۵)حوالہ سابق۔
(۹۶) نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ص ۵۳۳۔عبدالحمید،ابن ابی الحدید،شرح نہج البلاغۃ۱۳: ۱۹۷۔
(۹۷)عبدالحمید،ابن ابی الحدید،شرح نہج البلاغہ ۱۳: ۲۰۰۔
(۹۸) تفسیر العیاشی محمد بن مسعود،العیاشی ۱: ۱۷۔بحار الانوار۸۹: ۹۷۔
(۹۹)تفسیر العیاشی، محمد بن مسعود،العیاشی ۲: ۲۸۳۔
(۱۰۰)احمد،ابونعیم اصفھانی،حلیۃ الاولیاء ۱: ۶۵۔
(۱۰۱)محمد باقر،المجلسی،بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵و۸۹: ۵۱۔
(۱۰۲)علی بن ابراہیم، تفسیر القمی ۲: ۴۵۱۔بحار الانوار ۸۹: ۴۸۔
(۱۰۳)جلال الدین،السیوطی،الاتقان فی علوم القرآن ۵۹:۱۔
(۱۰۴)عبدالحمید،ابن ابی الحدید،شرح نہج البلاغہ ۱ ۲۷۔
(۱۰۵)محمد،الزرقانی،مناھل العرفان فی علوم القرآن ۲۴۷:۱۔
(۱۰۶)جلال الدین،السیوطی،الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۵۹۔
(۱۰۷)محمد، جزی الکلبی،التسھیل لعلوم التنزیل ۴:۱۔
(۱۰۸)ابوعبداللہ،البصری،الطبقات الکبری ۲: ۳۳۸۔
(۱۰۹)جواد،البلاغی النجفی،آلاءالرحمن فی تفسیر القرآن ۱: ۲۵۷۔
(۱۱۰) محمد باقر،المجلسی،بحار الانوار ۴۰: ۱۵۵۔
(۱۱۱)محمد،الزرقانی،مناھل العرفان فی علوم القرآن ۱: ۲۴۷۔
(۱۱۲) عبداللہ،البیضاوی،مقدمہ تفسیر البیضاوی وغیرہ۔
(۱۱۳)ابن ابی داود،کتاب المصاحف (مقدمہ) ص ۵۔
(۱۱۴) محمود،رامیار،خطوط مقریزی بحوالہ رامیار،تاریخ قرآن،ص ۳۷۴۔
(۱۱۵) حوالہ سابق۔
(۱۱۶)محمود،رامیار،تاریخ قرآن۔
(۱۱۷) المصاحف،ابن ابی داود ص ۲۱۔مقدمہ از: آرٹر جیفری محقق، ص ۵۔
(۱۱۸) ڈاکٹر جیفری ،مقدمہ المصاحف۔
(۱۱۹) حوالہ سابق۔
(۱۲۱)علی،ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ ۳: ۵۵۔
(۱۲۲) حوالہ سابق۔
(۱۲۳) جلال الدین،السیوطی،الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۰۔

(۱۲۴) محمد بن عبد الرحمن، المبارک فوری، تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی۔
(۱۲۵) محمد ہادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن ۱: ۲۸۱۔
(۱۲۶) محمد بن الحسن، الحر العاملی، وسائل الشیعۃ ۶: ۱۶۳۔
(۱۲۷) ۱۵ حجر: ۹۔
(۱۲۹) جلال الدین السیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور ۳: ۴۱۹۔
(۱۳۰) محمد بن جریر، الطبری، تاریخ طبری ۱: ۲۵۲۔
(۱۳۱) جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن ۱: ۱۲۱۔
(۱۳۲) حوالہ سابق۔
(۱۳۳) عبد اللہ، البیضاوی، مقدمہ تفسیر البیضاوی۔
(۱۳۴) فضل بن حسن، الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن ۹: ۲۱۸۔
(۱۳۵) محمد ہادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن ۱: ۲۸۹۔
(۱۳۶) ابو صادق، کتاب سُلیم بن قیس الھلالی، ص ۶۵۷ و بحار الانوار ۳۱: ۴۲۶۔

حس سماعت میں اللہ کی نشانیاں

Signs of Allah in Sense of Hearing

عبدالخالق النجفی

(فاضل جامعۃ الکوثر و متعلم حوزہ علمیہ نجف اشرف)

Abstract

The cognition of Allah is not possible with knowing himself. Therefore, it is necessary self-cognition to know about Allah. Imam Ali says that the person who knows himself will know about God. The man cannot know about himself without knowing five senses. On the day of resurrection, these senses will have been given power of speaking and they will tell everything about man. The sense of hearing is very important for mankind but it is gate of knowledge and wisdom. In this article, sense of hearing has been discussed in terms of defining signs of Allah. Meanwhile, it has been highlighted that the sense of hearing is great and complicated blessings of Allah on mankind. Moreover, it is elaborated that if a man knows the technicalities and benefits of this system, he will never forget the creator who is Allah.

Keywords: Signs, Allah, Sense, Hearing

مقدمہ

انسان کی خلقت کی غایت اس عالم میں مقام عبودیت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ [1] اور میں نے جن وانس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور پہلی عبادت معرفت ہے جس کی صراحت مولی الموحدین امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے اپنے کلمات میں کی ہے۔ فرماتے ہیں: "اوّل عبادۃ اللہ معرفتہ" [2] اللہ تعالیٰ کی پہلی عبادۃ اس کی معرفت ہے۔ جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی حدیث میں ہے: علم کا آغاز معرفت الٰہی سے ہے اور علم کی انتہاء، امور کو اس کے حوالے کرنا ہے۔ [3] جب معرفت خداوند متعال حاصل نہیں ہو گی تو پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنے تمام امور کسی ایسی ذات کے حوالے کر دے جسے وہ جانتا تک نہیں۔

اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کا دوسرا قول ہے: "مَنْ عَرَف نفسه فقد عرف رَبَّه"[4] جو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے گا۔(یعنی اپنے آپ کو حقیقی معنی میں جان لے گا) تو وہ بتحقیق اپنے رب کی معرفت حاصل کرلے گا۔اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ قول: کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو چھوٹا سا جسم ہے جبکہ تیرے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے۔[5]

لہذا اللہ تعالی کی معرفت موقوف ہے اس بات پر کہ انسان اپنے وجود کی معرفت حاصل کرے اور اپنے وجود ''جو کہ عالم اکبر'' ہے اس کی معرفت حاصل کرنا موقوف ہے انسان کے اس جسم میں موجود اعضاء و جوارح کی معرفت پر اور ان اعضاء میں سے اہم ترین حواس خمسہ ہیں جن کی معرفت اپنے نفس کی معرفت کے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے لہذا اسے ایسے وسائل بھی عنایت فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ حق کو باطل سے، خیر کو شر سے نفع کو نقصان سے اور حلال کو حرام سے جدا کر سکتا ہے اور ان وسائل میں اہم ترین حواس خمسہ ہیں۔اسی وجہ سے حواس خمسہ کے حامل افراد کی بہت بڑی مسئولیت ہے کہ وہ ان وسائل کو اللہ تعالی کی اطاعت اور رضایت کے حصول کے لئے استعمال کریں کیونکہ اس دنیا میں انسان جس طرح چاہے ان حواس سے استفادہ کرتا ہے لیکن آخرت میں انسان کے لئے ایسا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوند متعال ہے: يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔[6] اور اس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں۔

اسی طرح سورہ فصلت میں ارشاد رب العزت ہے: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّـهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔[7] وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی: اسی اللہ نے ہمیں گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویائی دی اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

موضوع کی اہمیت

جس شخص کے پاس سننے کی صلاحیت فعلاً موجود نہیں ہے اسے خوب ادراک ہوگا کہ قوت السمع کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس سے محروم شخص بہت سے علوم وفنون سے محروم ہوتا ہے۔اسے قاریِٔ قرآن کی خوبصورت آواز نہیں سنائی دیتی۔پرندوں کی خوبصورت آواز سننے سے محروم رہتا ہے۔لہذا سننے کی قوت صانع مدبر و حکیم کی ایک عظیم نعمت ہے۔

حس سماعت انسان کے وجود میں موجود اللہ تعالیٰ کی آیات اور نشانیوں میں سے ایک اہم ترین نشانی ہے۔ پس جب انسان کو اپنے نفس میں آیات الٰہی کا ادراک ہوگا، تو اس کی معرفت اور اس دانا و حکیم ذات پر اعتقاد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور بندہ الٰہی رنگ میں رنگ جائے گا اور عبودیت اور بندگی کو درک کرے گا اور اس طریقے سے ایک عبد اپنے معبود کی معرفت حاصل کرلے گا نتیجتاً وہ اس معبود کی اطاعت و بندگی کرنا شروع کرے گا۔ اس موضوع کو انتخاب کرنے کا راز بھی یہی ہے کہ بندگان خدا کو خدا کی معرفت کی طرف لے جایا جائے۔

لفظ آیت کے لغوی اور اصطلاحی معنٰی

آیۃ کی جمع آیات اور آیٌ ہے اور قرآن کریم میں کلمہ "آیۃ" ۸۲ آیات میں استعمال ہوا ہے۔ لغت عرب میں کلمہ "آیۃ" کو مختلف معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ آیۃ: علامت اور نشانی کے معنٰی میں استعمال کی جاتی ہے۔ آیۃ: عبرت کے معنی میں استعمال کی جاتی ہے جیسے: فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً۔[8] پس آج ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کی نشانی بنے۔

آیۃ: معجزۃ کے لیے بھی استعمال ہوئی ہے جیسے کہا جاتا ہے "ھو آیۃ زمانہ" یعنی وہ اپنے زمانے کا معجزہ ہے۔ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً۔[9] اور ابن مریم اور ان کی والدہ کو ہم نے ایک نشانی بنایا۔

آیۃ: نَموذَج اور مِثال کے معنی میں بھی استعمال ہوئی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ ھِیَ آیۃ فی الجَمَالِ۔ یعنی خاتون خوبصورتی میں بے مثال ہے یعنی بہت زیادہ خوبصورت ہے۔

آیت کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: قرآن کریم کے فقرات میں سے ایک فقرہ یا جملوں میں سے ایک جملہ جس کے آخر میں غالباً وقف ہوتا ہے اسے "آیۃ" کہتے ہیں۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ ۙ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔[10]

اور ہم جب ایک آیت کی جگہ پر دوسری آیت تبدیل کرتے ہیں تو اگرچہ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کررہا ہے لیکن یہ لوگ یہی کہتے ہیں کہ محمد تم افترا کرنے والے ہو حالانکہ ان کی اکثریت کچھ نہیں جانتی ہے۔

حس سماعت کی اہمیت

حصول علم و معرفت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب حواس خمسہ ہیں اور یہ بات وہ حضرات بھی مانتے ہیں جو خداوند متعال کو نہیں مانتے۔ کیونکہ مادّی حضرات جو مادّہ کو موجدِ کائنات تصور کرتے ہیں ان کی نظر میں بھی حواس خمسہ ہی

مخصراً حصول علم کے وسائل ہیں اور وہ حواس خمسہ کی حدود سے خارج کسی چیز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ان حواس خمسہ میں سے حس سماعت بہت اہمیت کی حامل ہے۔قرآن کریم میں لفظ "سمع" 117 مرتبہ استعمال ہوا ہے اور وہ بھی الف اور لام کے ساتھ۔

" السمع" 11 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔یعنی کل تقریبا128 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حسِ سماعت تعلّم کے لئے اساسی وسیلہ ہے جو حاسة البصر سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ حسِ سماعت یعنی کان ہر طرف سے آنے والی آوازوں کو ایک ساتھ سننے کی صلاحیت رکھتا ہے جبکہ آنکھ فقط اسی طرف دیکھ سکتی ہے جو اس کے سامنے ہو۔

حسّ سماعت کو حسّ بصارت پر تقدیم کے اسباب

ارشاد خداوند متعال ہے: وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔[11] اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے کہ شاید تم شکر کرو۔

اس آیۃ شریفہ اور باقی بہت سی آیات شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے **قوّۃ السمع** کو قوّۃ البصر پر مقدم کر کے بیان کیا جو دلالت کرتا ہے کہ قوّت سماعت کو باقی حواس کے ساتھ ساتھ قوّت بصر پر بھی فوقیت حاصل ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کان کو اللہ تعالیٰ نے حصول معرفت و علم کا اولین درجہ قرار دیا ہے۔اس کے کچھ اسباب علماء حضرات نے ذکر کیے ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ کان صلاحیت رکھتا ہے کہ دیوار یا پردے کے پیچھے کی آواز سن سکے اور سمجھ لے جبکہ آنکھیں کسی بھی مانع جیسے پردہ، دیوار، تاریکی وغیرہ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتیں۔قوّۃ السمع کے دھوکا کھانے کے امکانات کم ہوتے ہیں آنکھوں کی نسبت، جب کہ آنکھیں بہت زیادہ موارد میں دھوکا کھا جاتی ہیں۔جدید علوم نے بھی ثابت کیا ہے کہ تحصیل علوم کے لیے سمع یعنی کان اہم ذریعہ ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جس انسان کے پاس آنکھیں نہ ہوں وہ مختلف زبانیں سیکھ لے اور مختلف علوم کی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن جس کے پاس قوّۃ سماعت نہ ہو تو وہ اس عالم سے منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے ساتھ جس وسیلے سے وہ رابطہ رکھ سکتا ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے پس اگر وہ لوگوں کی باتیں، ان کے نام وغیرہ نہیں سن سکے گا تو تمام اشیاء اس کے لئے بے معنیٰ ہو کر رہ جائیں گی اور بولنے کی صلاحیت بھی اس کے پاس نہیں ہوتی اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جو بچہ سن نہیں سکتا وہ ہمیشہ بول بھی نہیں سکتا۔

لہذا اس کے لئے زندگی بہت مشکل بن جاتی ہے۔[12] البتہ اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ وہ بالکل کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا بلکہ وہ اشارات وغیرہ کے ذریعے کچھ سیکھ سکتا ہے باوجود اس کے کہ اس کے پاس نہ قوۃ سماعۃ ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ آج کل ہمارے زمانے میں تو ایسے بچوں کے لیے بہت زیادہ سکول اور باقاعدہ نظام تعلیم پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیونکہ قوّۃ سماعت سے محروم انسان مختلف حروف کی آوازیں سن نہیں سکتا ان کے تلفظ "Pronunciation" کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا خصوصاً جب کہ مختلف لغات کے کافی حروف ایک دوسرے سے شکل و صورت میں ملتے جلتے ہوں۔ تو قوت سماعت کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے عقل کے ساتھ فقط قوّۃ سمع کا ذکر کیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ قوّت سماعت اور قوت عاقلہ کے درمیان بہت گہرا ربط ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوند متعال ہے: وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ۔[13] اور وہ کہیں گے ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمیوں میں سے نہ ہوتے۔

جہنم جانے والے افسوس اور اعتراف کے لہجے میں کہیں گے: اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے۔ اس آیۃ شریفہ کے مطابق نجات کی راہ اختیار کرنے کے دو طریقے ہیں۔: سمعی اور عقلی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں سمع اور عقل نہیں فرمایا بلکہ سمع یا عقل فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں میں سے ایک اختیار کرنے سے نجات کا راستہ مل جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو صحیح کام میں لایا جائے تو دوسرا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العالمین ہے۔ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ۔[14] یقیناً مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں۔ دوسری آیت شریفہ میں ہے: وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ۔[15] اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔ اس آیۃ شریفہ میں بھی سمع کو عقل کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور آیت شریفہ میں ارشاد خداوند متعال ہے: أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ۔[16] کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سننے یا سمجھنے کے لیے تیار ہیں؟ اس آیت میں بھی سمع یا عقل میں سے ایک راستے کے اختیار کو ہدایت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔[17]

علمائے طب نے کشف کیا ہے کہ نطفے کے رحم مادر میں منعقد ہونے کے 22 دن سے سمع اور بصر کی جگہ واضح ہونا شروع ہو جاتی ہے. لیکن بچہ ولادت کے بعد فقط روشنی کو دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ ولادت کے بعد تین مہینے گزرنے تک اور اشیاء کو ان کے رنگوں کے ساتھ چار مہینے گزرنے کے بعد دیکھتا ہے- جبکہ 26 ہفتے گزرنے کے بعد یعنی تقریباً ساڑھے چھ ماہ گزرنے کے بعد ابھی وہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے اور آوازیں سننا شروع کرتا ہے- وہ اپنی ماں کی دل کی دھڑکن سنتا ہے اور وہ جھلی جس میں بچہ رحم مادر میں لپٹا ہوا ہوتا ہے اور بوقت ولادت بچے کے ساتھ نکلتی ہے اس کی سرسراہٹ سنتا ہے یا ماں کے ہنسنے

اور قہقہہ لگانے کی آواز یا اس کے پیٹ میں بھوک یا کسی اور وجہ سے گڑ گڑانے کی آواز کو سنتا ہے اور تجربے نے ثابت کیا ہے کہ وہی آواز ولادت کے بعد جب بچے کو سنائی جاتی ہے تو وہ روتا ہوا بچہ خاموش ہو جاتا ہے۔[18]

قوّت سماعت ہمیشہ بیدار رہتی ہے لہذا کانوں کے علاوہ باقی اعضاء مخصوص انداز سے آرام کرتے ہیں جب کہ کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں چاہے انسان جاگا ہوا ہو یا نیند میں ہو۔ کان ہمیشہ سنتے رہتے ہیں اسی وجہ سے آپ جب سوئے ہوئے ہوتے ہیں[19] اور کوئی آواز سنتے ہیں تو فوراً بیدار ہو جاتے ہیں۔ سورہ کہف کی آیت شریفہ میں ہے: فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا[20] پھر کئی سالوں تک غار میں ہم نے ان کے کانوں پر ''نیند کا'' پردہ ڈال دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے کانوں پر پردہ ڈال دیا، عین ممکن تھا کہ وہ اونچی آوازوں کو سن کر بیدار ہو جاتے اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف نہ ہوتا۔ کان ایک ہی وقت میں مختلف اور ہر طرف سے آنے والی آوازیں نا فقط سن سکتے ہیں بلکہ سنتے ہیں اور ان میں تمیز بھی کر لیتے ہیں کہ یہ آذان کی آواز ہے یہ تلاوت قرآن کی ہے اور یہ موسیقی کی وغیرہ وغیرہ، جب کہ آنکھ ایک وقت میں فقط سامنے والی اشیاء کو دیکھ سکتی ہے اور باقی جو اشیاء اس کے سامنے نہ ہوں ان کو نہیں دیکھ سکتی۔

میڈیکل کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جب انسان کا انتقال ہوتا ہے تو حواس میں سے وہ حس جو سب سے آخر تک کام کرتی ہے وہ قوّت سماعت ہی ہے یعنی یہ سب سے پہلے ماں کے پیٹ سے اپنا کام شروع کرتی اور سب سے آخر میں انتقال کے بعد تک سنتی ہے بلکہ جب قیامت کا دن آئے گا اور صدائیں اٹھائی جائیں گی تو اس وقت بھی وہ آواز جو دی جائے گی اسے ہر کان سنے گا اور قبر سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔[21] پس یہ کچھ اسباب تھے جن کی وجہ سے قوّت سمع کو مقدم کیا گیا ہے۔

قوّتِ سماعت "کان" کی حیرت انگیز تخلیق کے بارے میں سائنسی نقط نظر

جدید ترین کمپیوٹرز اور سائنسی ترقی کے کمالات ممکن ہے آپ کو حیرت زدہ کر دیتے ہوں لیکن اعلیٰ ترین حساس ٹیکنالوجی کا جو عظیم نمونہ آپ کی پیدائش سے بھی پہلے آپ کے پاس موجود ہے اس پر شاید ہی آپ نے کبھی غور کیا ہو۔ قدرت نے جو اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی آپ کے جسم میں استعمال کی ہے اس کے سامنے مستقبل کے سپر کمپیوٹرز بھی ایسے ہوں گے جیسے سمندر کے سامنے پانی کا ایک قطرہ ہو۔ کہ ابھی انسان ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آوازوں سے بھری دنیا میں انسان کی ضروریات کے پیش نظر اپنی اعلیٰ ٹیکنالوجی کے دو بیش قیمت شاہکار انسان کے سر کے دونوں جانب فٹ کر دیتا ہے۔ یعنی انتہائی مختصر جگہ میں کان میں اتنے الیکٹریکل سرکٹ موجود ہیں کہ اتنے سرکٹس کے ذریعے ایک بڑے شہر کو ٹیلی فون کی سہولیت آسانی سے فراہم کی جاسکتی ہے اور حیرت ہے کہ یہ تمام سرکٹس چھوٹی انگلی کے ناخن کے برابر موجود جگہ میں کام کرتے ہیں۔

کانوں کے متعلق عام لوگوں کی دو اہم غلط فہمیاں

1: ایک یہ کہ وہ کانوں کے بیرونی حصے کو، کان سمجھتے ہیں۔

2: دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کانوں کی ذمہ داری فقط سننا ہے۔جب کہ کانوں کا وہ حصہ جو آپ کو سر کے دونوں جانب نظر آتا ہے اس کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ آوازیں جمع کر کے اپنے ایک مخصوص انداز سے اندرونی کان تک پہنچا دے بالکل جس طرح ڈش انٹینا کا کام کرتا ہے لہذا باہر دکھائی دینے والا حصہ خود کان نہیں بلکہ کانوں کا ڈش انٹینا ہے۔

انسان کے جسم کا توازن قائم رکھنا بھی کانوں کے ذریعے ہوتا ہے کیونکہ اگر کان دماغ کو مخصوص سگنلز دینا بند کر دیں تو پھر جسم کا کوئی حصہ آپ کو بار بار گرنے اور چوٹیں لگنے سے بچا نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دونوں کان نہ ہوتے تو انسان تنہائی کا شکار ہوتا اور دنیا کی آوازوں اور زبانوں سے انسان کا رشتہ کٹ جاتا۔

ماں کی لوری، پرندوں کی چہکار، پتوں کی سرسراہٹ جیسی حسین آوازیں انسان کبھی نہ سن پاتا اور زندگی بے مزہ ہو جاتی۔ سننے کے جادوئی عمل کی ابتدا بیرونی کان سے ہوتی ہے۔ یہاں سے ایک انچ لمبی چھوٹی سی نالی شروع ہو کر آپ کے ایئر ڈرم Ear Drum تک جاتی ہے۔ اور یہ نالی بل کھاتے ہوئے ایئر ڈرم تک اس طرح پہنچتی ہے کہ راستے میں موجود حساس تنصیبات کو نقصان نہ پہنچے۔

اس نالی میں نازک بالوں کا ایک جنگل آباد ہے۔ یہاں گوند پیدا کرنے والے غدود wax ramus کے تقریباً چار ہزار پلانٹ کام کرتے ہیں۔ بالوں اور گوند کے اس گھنے جنگل کی وجہ سے بیرونی دنیا سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے والے کیڑے، مکوڑے، بیکٹریاز، مٹی کے ذرات یا دوسرے نقصان دہ اجسام فوراً ہی پکڑے جاتے ہیں اور موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔

اگر یہ حفاظتی اقدامات نہ ہوتے تو جسم کے یہ بالائی سرحدی علاقے دشمن کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکتے۔ خاص طور پر سمندر، یا کسی بھی جگہ پانی میں نہاتے یا زمین پر سوتے وقت بہت سے خطرناک جراثیم کانوں کے اندر داخل ہو سکتے ہیں لیکن یہ دفاعی انتظامات اس طرح کے تمام دہشت گردوں کو ناکام کر دیتے ہیں۔

کان کا ایئر ڈرم Ear Drum تنی ہوئی سخت لیکن باریک جھلی سے بنا ہوتا ہے یعنی کسی ڈھول کے منہ پر چڑھی ہوئی جھلی کی مانند۔ اور اسی سے سماعت کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ جھلی آدھے انچ سے بھی کم ہوتی ہے۔ لیکن ہوا کی آواز ایئر ڈرم سے اس طرح ٹکراتی ہے جیسے ڈھول پر چھڑی ماری جائے۔ البتہ اصل عجوبہ اس ڈھول کی حساسیت ہے جسے ایئر ڈرم کہا جاتا ہے۔ ہلکی سی سرگوشی، مدہم سی آواز، معمولی سی گونج بھی اسے بجنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر یہ حساس گونج پردہ کے ایک ارب ویں

حصے کے برابر بھی متحرک ہو تو کان سے لے کر دماغ کے مخصوص حصے تک عمل اور رد عمل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ ننھی سی لہر آپ کے لیے ایک با معنیٰ لفظ اور ایک اہم اطلاع بن جاتی ہے۔

ہوا کی آواز بردار لہریں آپ کے لیے با معنیٰ الفاظ کیسے بن جاتی ہیں؟ اسے کسی حد تک سمجھنے کے لیے آپ کو اپنے کان کے مرکز middle ear کو اندر سے دیکھنا پڑے گا۔ یہ مرکز بمشکل ایک دانے کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں تین ننھی منی ہڈیاں نصب ہیں۔ ان میں سے ایک ہڈی بالکل ہتھوڑے کی شکل کی ہے۔ جبکہ دوسری ہڈی انگریزی حرف u کی طرح ہے اور تیسری ہڈی لوہار کے اس اوزار کی مانند ہوتی ہے جس پر وہ کسی دوسری چیز کو رکھ کر ہتھوڑی سے ضرب لگاتا ہے۔ ان تینوں ہڈیوں کو بالترتیب انگریزی میں stapes – malleus –incus کہا جاتا ہے۔ تینوں ہڈیاں انہیں چیزوں سے مشابہ ہیں۔ اور آواز کی لہروں کی وجہ سے کان کے ایئر ڈرم یا پردے میں پیدا ہونے والے ارتعاش کو آگے بڑھانا انہی ہڈیوں کی ذمہ داری ہے جو آواز کو 22 گنا تیز کر کے u کی شکل والی ہڈی میں موجود ایک بیضوی کھڑکی کے ذریعے اندرونی کان میں پہنچاتی ہیں۔

اندرونی کان جو اصل آلہ سماعت ہے ایک غار نما قلعہ میں واقع ہے۔ یہ قلعہ جسم کی مضبوط ترین ہڈیوں سے تعمیر کیا گیا ہے اور پانی جیسے سیال مادے سے بھرا رہتا ہے۔ جب u شکل کی ہڈی آواز کی لہریں اندرونی کان میں کھلنے والی بیضوی کھڑکی کے ذریعے اندر پہنچاتی ہے تو سماعت مرکز cochlea کی اندرونی نالیوں میں موجود سیال مادے میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اور بالفرض اگر باہر سے کسی نے آپ کا نام پکارا ہو مثلاً اس نے کہا ''علی'' تو سماعت مرکز کے لاکھوں بال نما خلیوں میں سے صرف ''ع-ل-ی'' کا ارتعاش محسوس کرنے والے خلیے ہی متحرک ہوں گے۔ ان خلیوں کی حرکت بالکل ایسی ہو گی جیسے پانی کے اوپر اگنے والے پودے ہوا کے جھونکوں سے حرکت کرتے ہیں۔ خلیوں کی یہ خفیف سی حرکت ایک بہت مدھم برقی رو پیدا کرے گی جو انتہائی برق رفتاری سے آڈیٹری نرو Auditory naive میں سرایت کر جائے گی۔ یہ آڈیٹری نرو پینسل کے سکے کی مانند پتلی ہے اور اس میں تیس ہزار الیکٹریکل سرکل کام کرتے ہیں۔ آڈیٹر نرو اس برقی رو کو چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر موجود دماغ کے مخصوص حصے تک پہنچا دے گی۔ اس کے بعد اس آواز کی حد تک کانوں کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اب یہ دماغ کی ذمہ داری ہے کہ بیک وقت موصول ہونے والی آواز کی ہزاروں لاکھوں لہروں کے برقی سگنلز کو وصول کر کے انہیں الگ الگ کرے۔ پھر یکجا کرے۔ ان آوازوں سے متعلق پہلے سے ریکارڈ شدہ بے شمار معلومات کو ہر آواز کے ساتھ الگ الگ منسلک کرے اور انہیں با معنی آوازوں میں تبدیل کر دے تاکہ مشینوں کے شور، ٹریفک کی آوازوں، بارش کی آواز، پرندوں کی چہکار، پتوں کی سرسراہٹ، بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور اپنے دوست کی آواز کو آپ بیک وقت سن سکیں۔

انہیں نہ صرف پہچان سکیں بلکہ صرف آواز کے ذریعے آپ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں الگ الگ لاکھوں کروڑوں اقسام کی معلومات حاصل کر سکیں جو پہلے ہی سے دماغ کے کسی حصے میں اس مقصد کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

مثلاً: اذان کی آواز سن کر مسجد جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور فائرنگ کی آواز سن کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اگرچہ آپ کا خیال ہے کہ آپ کانوں سے سنتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کانوں کے ذریعے دماغ میں سنتے ہیں۔

زیادہ تر لوگ اپنے کانوں کو صرف سننے کا آلہ سمجھتے ہیں لیکن قوت سماعت کان کے عجائبات کا ایک حصہ ہے کہ آپ کے جسم کا توازن برقرار رکھنے کا نظام بھی کانوں ہی میں کام کرتا ہے اور ہر پل آپ کے توازن کی نگرانی کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قدرت نے کان میں نیم دائروں کی شکل کی تین ننھی منی نالیاں بنائی ہیں۔ انہیں سمی سرکلر کینال کہا جاتا ہے۔ یہ نالیاں ہر وقت ایک پانی جیسے سیال مادے سے بھری رہتی ہیں۔ اور پورے جسم کا توازن انہی کے ذریعے مانیٹر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک خاص نالی جسم کے اوپر نیچے کی حرکات کی نگرانی کرتی ہے۔ دوسری جسم کے سامنے کی طرف کی حرکات پر نظر رکھتی ہے اور تیسری دائیں بائیں سمت کی حرکات مانیٹر کرتی ہے۔

چنانچہ اگر کبھی اتفاق سے چکنے فرش پر اچانک آپ کا پیر پھسل جائے اور آپ کسی طرف گرنے لگیں تو ان میں سے متعلقہ نالی میں سے سیال مادہ غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس نالی میں موجود خلیے سیال مادہ کی عدم موجودگی کو محسوس کر کے دماغ کو اس کے بارے میں مطلع کرتے ہیں۔ پس دماغ کا مخصوص حصہ جو اس طرح کی ہنگامی حالت کو کنٹرول کرنے کا ذمہ دار ہے فوراً ایکشن میں آجاتا ہے۔ ایسے میں اگر آپ دائیں جانب گر رہے ہوں تو دماغ جسم کے بائیں حصے کے پٹھوں کو سخت ہو جانے کے احکامات جاری کرتا ہے اور اگر بائیں جانب گر رہے ہوں تو اس کے برعکس حکم جاری کرتا ہے۔ اور اس طرح آپ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں اور جسم بہت سی ممکنہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہتا ہے۔

اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ ماں باپ پانچ، چھ برس کے بچے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گرد تیزی سے گھماتے ہیں اور پھر اس کے پاؤں زمین پر رکھ کر اسے کھڑا کر دیتے ہیں تو بچہ چکرا کر گرنے لگتا ہے۔ بچے کے چکرانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے کانوں میں موجود توازن برقرار رکھنے والی تینوں نالیوں میں موجود سیال مادہ تیزی سے اپنی پوزیشن بدلتا ہے اور اتنی تیزی سے یہ نالیاں دماغ کو سگنلز روانہ کرتی ہیں کہ دماغ اتنی تیزی سے اتنے زیادہ سگنلز سے نبرد آزما ہونے میں ناکام رہتا ہے اور عارضی طور پر وہ پٹھوں کو مناسب طور پر کنٹرول کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

اگر یہ صورتحال زیادہ عرصہ باقی رہے تو پھر جسم کے دوسرے نظام بھی متاثر ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً سمندری جہاز یا کشتی پر سفر کے دوران کشتی کے بار بار اچھلنے سے بھی یہ صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسے میں آپ کو بہت زیادہ پسینہ آسکتا ہے۔ متلی کی کیفیت محسوس ہو سکتی ہے۔ اس کیفیت کا نام موشن سکنیس motion sickness ہے۔ پہاڑی سفر کے دوران گھومتی ہوئی سڑکوں پر سفر کرنے سے بھی اکثر یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔

قوّت سماعت انسان کے پیدا ہوتے ہی بتدریج روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ اور آپ کے اندر قوّت سماعت کے کم ہوتے جانے کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہر سال کان کی اندرونی بافتوں tissues کی لچک کم ہوتی جاتی ہے۔ آوازیں محسوس کرنے والے بالوں کے خلیے پرانے ہوتے جاتے ہیں اور کان کے بعض حساس مقامات پر کیلشیم کے ذرات جمنے لگتے ہیں۔ ایسے میں جب آپ بچپن کی عمر میں تھے تو آپ کی قوّت سماعت 16 ہزار سے 30 ہزار سائکلز فی سیکنڈ تھی۔ اگر آپ کی قوت سماعت 16 ہزار سائکلز فی سیکنڈ سے کم ہوتی تو آپ کو اپنے جسم کی اندرونی آوازیں بھی ہر لمحے سنائی دیا کرتیں۔ مثلاً آپ اپنے دونوں کانوں کو اپنی انگلیوں سے سختی سے بند کرلیں تب بھی آپ کو ایک خاص قسم کی آوازیں مستقل سنائی دیتی رہیں گی۔ یہ آوازیں دراصل آپ کی تنی ہوئی انگلیوں اور بازؤں کے پٹھوں کی لرزش سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن جب آپ لڑکپن کی عمر کو پہنچتے ہیں تو آوازوں کے ارتعاش کو سننے کی صلاحیت جو پہلے تیس ہزار سائکلز تھی، کم ہو کر بیس ہزار سائکلز فی سیکنڈ ہو جاتی ہے اور اگر اس وقت آپ چالیس، پنتالیس برس میں ہیں تو آپ کی حد سماعت آٹھ ہزار سائکلز فی سیکنڈ سے زیادہ نہیں اور جب 80 برس کی عمر میں پہنچیں گے تو قوّت سماعت اس سے بھی آدھی یعنی چار ہزار سائکلز فی سیکنڈ رہ جائے گی۔

ایسی صورت میں آپ کسی کمرے میں دو آدمیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت تو آسانی سے سن سکیں گے لیکن شور وغل کے ماحول میں کوئی بات سن کر سمجھنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ ایسے میں آہستہ بولنے والوں کی آواز تو آپ بہتر طور پر سن سکے گے۔ لیکن اس کے برعکس زور سے بولنے والوں کی آواز اور بات بہتر طور پر سننا آپ کے لئے دشوار ہو گا۔

آپ نے اکثر بزرگوں کو دیکھا ہو گا کہ بظاہر وہ اونچا سنتے ہیں لیکن سرگوشی میں کی گئی بات انہیں صاف سنائی دے جاتی ہے۔ قوّت سماعت ڈسیبل "decibel" یعنی آوازوں کی اونچائی ناپنے کی اکائی کے حساب سے بھی روبہ تنزل ہوتی ہے۔ ڈسیبل کو آپ اس طرح سمجھیں کہ خاموش کمرے میں چار فٹ کے فاصلے پر کی گئی سرگوشی 30 ڈسیبل طاقت کی ہوتی ہے۔ عام گفتگو میں آواز کی طاقت 60 ڈسیبل ڈرم بجانے کی آواز 120 ڈسیبل اور شارٹ گن کے فائر کی آواز 140 ڈسیبل کی ہوتی ہے۔ عام گفتگو 60 ڈسیبل اور ڈرم کی آواز 120 ڈسیبل کا مطلب ڈرم کی آواز کا عام گفتگو کی آواز سے محض دگنا ہونا نہیں بلکہ صرف 20 ڈسیبل کا اضافہ ہے۔ آواز کی اونچائی کے حساب سے دراصل سینکڑوں گنا اضافہ ہوتا ہے۔

اگر چالیس، پینتالیس برس کی عمر میں آپ کی قوّت سماعت 40 ڈسیبل کم ہو چکی ہے۔ تو فی الوقت یہ ٹھیک حالت میں ہے لیکن آپ اکثر اپنے مخاطب سے "جی...! کیا فرمایا؟ جیسے الفاظ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یعنی آپ " سنتا نہیں ہوں، بات مکرر کیے بغیر" والی عمر میں داخل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ سننے کی یہ حیرت انگیز صلاحیت ہمیشہ سے آپ کے پاس ہے۔ لیکن آپ نے شاید ہی کبھی اللہ تعالیٰ کے اس معجز نما عظیم عطیے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا ہو۔

شکریہ ادا کرنا اس وقت صحیح معنی میں ممکن ہے جب آپ اس چیز کی اہمیت سے واقف ہوں۔ بہر حال آپ نے قدرت کے اس گراں بہا تحفے سے آگاہی حاصل کی تو شکر ادا کرنے میں دیر نہ کریں اور اس قادر مطلق، صانع حکیم و مدبر ذات کے سامنے سر سجدے میں رکھ کر شکر ادا کریں جس نے اپنی حکمت بالغہ سے آپ کے وجود میں اس آلہ سماعت کو خوبصورت انداز میں سجایا ہے۔

نوٹ: مذکورہ وضاحت کان کی حیرت انگیز تخلیق کے بارے میں لکھی گئی چند کتب کے مطالعے کے بعد موزون ترین کتاب سے جوں کی توں نقل کی ہے۔[22]

کریسی موریسون کا قوّتِ سماعت کے متعلق بیان

کریسی موریسون اپنی کتاب میں فصل ثامن عزائز الحیوانات کے تحت صفحہ 44 پر لکھتا ہے: "انسان کے کان کا جزء حقیقت میں چار ہزار کمانوں کا سلسلہ ہے جو دقیق اور محکم انداز میں موجود ہے اور ایک نظم وضبط کے ساتھ شکل و حجم کے لحاظ سے موجود ہے۔ پھر آخر میں کہتا ہے: شاید وہ قوّت جس نے اس محکم نظام کو منظم کیا ہے جانتی ہے کہ انسان مستقبل میں اس کا محتاج ہو گا لہذا پہلے سے ہی اسے انسان کے وجود میں رکھ دیا ہے کیونکہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ مصادفۃ (اتفاقاً) ایسا نظام وجود میں آگیا ہو اور کان کا مرتب اور محکم وجود خود بخود وجود میں آگیا ہو۔[23] مصنف اسی کتاب کے صفحہ نمبر 16 پر (الفصل الاوّل عالمنا الفذ) کے عنوان کے تحت ایک مثال ذکر کرتا اور ثابت کرتا ہے کہ انسان میں اس طرح کا محکم وجود تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ مصادفۃ (اچانک) ہو ایسا ممکن نہیں ہے اور اس طرح کے اعضاء وجوارح انسان کے مرتب، منظم، لاکھوں cells اور باقی بہت سی رگیں، ہڈیاں، دل، دماغ اور باقی اشیاء وجود انسان میں محکم انداز میں موجود ہیں جو کہ حقیقت میں عالم اکبر ہے۔ کریسی موریسون کہتا ہے کہ مثلاً (مثال کی وضاحت اپنے الفاظ میں رقم کر رہا ہوں) ایک سفید کاغذ اٹھایا جائے اور اس کے دس ٹکڑے کیے جائیں اور ان دس ٹکڑوں پر ایک سے لے کر دس تک 1-10 اعداد کو لکھا جائے پھر ان سب پرچوں کو جیب میں ڈالیں اور جیب کو اچھی طرح ہلائیں اور اب ایک ایک کر کے پرچے نکالتے جائیں۔ اب پہلی پرچی پہلے نمبر والی نکلے اس کے چانسز 10 دس میں سے ایک فیصد ہیں پہلی اور دوسری نمبر والی پرچیاں مترتب نکلیں اس کے چانسز 100 میں سے ایک فیصد ہیں۔ پھر پہلا، دوسرا، تیسرا نمبر ترتیب کے ساتھ نکلے اس کے چانسز 1000 ہزار میں سے ایک فیصد ہیں پھر 1-2-3-4 چاروں مترتب انداز سے نکلیں اور یہ بھی کہ پہلی پرچی پہلے نمبر کی دوسری پرچی، دوسرے نمبر کی تیسری پرچی، تیسرے کی اور چوتھی پرچی چوتھے نمبر کی نکلے اس کے چانسز دس ہزار 10000 میں سے ایک فیصد ہیں اور اسی طرح ایک سے لیکر 10 نمبر تک ترتیب سے پرچیاں نکلیں اس کے چانسز 10 دس بلین میں سے ایک فیصد ہیں۔[24]

اب آپ نے کان کی حیرت انگیز تخلیق سائنسی نقطہ نظر سے ملاحظ فرمائی۔ کیا ممکن ہے کہ ایسی محکم تخلیق خود بخود ہو گئی ہو؟ اس امکان کا احتمال بھی اربوں، کھربوں میں سے ایک فیصد بلکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ پس آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اتنے چھوٹے سے کان کی جگہ میں ایک پورا نظام بنانا موجود ہے جو منظم انداز میں اپنا کام کر رہا ہے تو آیا ایک حکیم، مدبر، قادر مطلق ذات کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ایسا نظام ممکن ہے؟ جواب میں ہر صاحب عقل کہے گا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کان بھی تخلیق کے اعتبار سے آیات الٰہی میں سے ایک آیۃ اور معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اس حکیم کا عظیم عطیہ ہے۔

عیوب کا تجسس اس عظیم نعمت کا ناجائز استعمال

انسان کے وجود میں اس آیت عظمیٰ کو کیسے اللہ تعالی کی اطاعت میں استعمال کیا جائے؟

اس سوال کے جواب میں درج ذیل آیات کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں۔

1: قال اللہ تبارک وتعالیٰ: ولاتجسسوا۔[25] اور تجسس نہ کیا کرو۔ دوسروں کے راز جاننے کی کوشش نہ کرو۔ دوسروں کے عیوب جاننے اور ان کے نجی معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ انسان کے نجی معاملات پر جب پردہ پڑا ہوا ہے اس پردے کو چاک کرنے کی کوشش جرم ہے کیونکہ اس تجسس سے لوگوں کا راز فاش اور وقار مجروح ہوتا ہے۔

اللہ تعالی خود ستار العیوب ہے اور وہ اپنے بندوں کو بھی حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی پردہ پوشی کرو، راز فاش نہ کرو اور لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرو۔ تجسس سے منع کرنے کے بارے میں روایات بھی کثرت سے موجود ہیں۔

حدیث نبوی ہے: کوئی اگر اپنے ہمسائے کے گھر جھانکتا ہے اور کسی مرد کے راز یا عورت کے بالوں یا اس کے جسم کے حصے پر نظر پڑتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کر سکتا ہے ان منافقوں کے ساتھ جو دنیا میں مسلمانوں کے راز ٹٹولتے تھے[26].
امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی ہے جو شخص لوگوں کے راز ٹٹولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا راز فاش کرے گا۔[27]

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔[28] اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے بازپرس ہو گی۔

اگر کوئی عمل یا عقیدہ سننے سے متعلق ہے تو قوّت سماعت سے سوال ہو گا کہ کہیں علم کے علاوہ ظن و گمان پر تو عمل نہیں کیا؟ اگر یہ عمل یا عقیدہ دیکھنے والے امور سے متعلق ہو گا تو قوّت بصارت سے سوال ہو گا۔ اگر اس قسم کے نظریہ کا قیام

فکر و تعقل سے مربوط ہے تو دل سے سوال ہو گا۔ ان سے سوال اسی لیے ہو گا کیونکہ یہ علم ویقین کے حصول کے ذرائع ہیں اور علم ویقین حاصل ہونے سے پہلے اگر قدم اٹھ گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان ذرائع کا صحیح استعمال نہیں ہوا۔[29]

ایک اہم نکتہ: بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مسئولیت جو آیۃ مذکورہ یعنی اسراء، آیۃ 36 نے بیان کی ہے صاحب اعضاء کے کاندھوں پر ہو گی نہ کہ ذاتاً اعضاء پر۔ جب کہ بہت زیادہ قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود اعضاء باالذات مسئول ہوں گے جیسا کہ سورہ فصلت میں ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔[30] تو وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ جواب دیں گی: اسی اللہ نے ہمیں گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویائی دی اور اس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

اعتراض وجواب

اعتراض یہ ہے کہ گواہی تو باقی اعضاء بھی انسان کے خلاف دیں گے جیسے ارشاد رب العزت ہے: يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔[31]

اس دن ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان سب اعمال کی گواہی دیں گے جو یہ کرتے رہے ہیں لیکن اعتراض فقط کھال پر کیوں انسان کر رہا ہے؟؟

پہلا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے چونکہ کھال پورے جسم پر محیط ہے لہذا اس کی گواہی تمام جرائم پر محیط ہے۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ دیگر اعضاء نے جرم سرزد ہوتے ہوئے دیکھا، سنا ہے جب کہ کھال ایسی ہے کہ اسی کے ذریعے جرم سرزد ہوا ہے۔[32]

سوال یہ ہے کہ سورہ اسراء کی آیت 36 میں حواس خمسہ میں سے فقط حاسۃ السمع اور حاسۃ البصر کا ہی کیوں ذکر کیا ہے؟

جواب: کیونکہ معلومات حسی کا بہت زیادہ حصہ ان ہی دو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا آپ نے ان دونوں حواس کا ذکر کیا ہے۔

سید الساجدین زین العابدین علیہ السلام کا حق سماعت کے متعلق لطیف و فکر انگیز فرمان

کان کا حق یہ ہے کہ اس کو غیبت کے سننے سے دور رکھا جائے اور ایسی چیزوں کے سننے سے دور رکھا جائے جن کا سننا جائز نہیں ہے اور کان کو دل کا راستہ قرار دینے سے بچایا جائے سوائے اس اچھی بات کے جو آپ کے دل میں بھلائی پیدا کرے یا اچھا اخلاق کسب کرے کیونکہ کان باتوں کو دل تک پہنچانے کا دروازہ ہے جو مختلف معانی دل تک پہنچاتا ہے جس میں خیر اور شر دونوں طرح کے معانی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی قوّت نہیں ہے۔[33]

خلاصہ بحث

قوت سماعت اللہ کی عظیم نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جس کی اہمیت، حقوق اور موارد استعمال کے بارے میں بہت ساری آیات اور روایات دلالت کرتی ہیں ان تمام سے یہ نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ قوّۃ سماعت کی دو اقسام ممکن ہیں۔ (1) مشروع اور قابل مدح سماعتیں۔ (2) ممنوع سماعتیں (ایسی چیزوں کا سننا جنہیں شریعت نے حرام قرار دیدیا ہے)

حرام اور ممنوع سماعتیں

جن چیزوں کے سننے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ ان کی مثالیں درج ذیل ہیں اگرچہ مذکورہ آیات و روایات میں ان کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ قوّۃ سماعت جیسی عظیم نعمت کے شکریہ کے ساتھ اسے درج ذیل چیزوں کی سماعت سے محفوظ رکھنا چاہئے۔

غیبت کے سننے، موسیقی کے سننے، تجسس سے، لغو و فحش باتوں سے اور ہر گمراہ کن اور خداوند متعال سے دور کرنے والی بات سے۔

جائز اور مشروع سماعتیں

جائز سماعتوں کی مثالیں : تلاوت قرآن سننا۔ جیسا کہ درج ذیل آیۃ شریفہ میں ارشاد رب العزت ہے: وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔[34] اور جب قرآن پڑھا جائے تو پوری توجہ سے اسے سنا کرو اور خاموش رہا کرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔ ہدایت کی باتیں سننا، اخلاقیات پر مشتمل باتیں سننا، احکام ، وعقائد پر مشتمل باتیں سننا، انبیاء کرام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے فرامین ، اقوال ، وقصص وغیرہ سننا تاکہ ان سے نصیحت اور عبرت حاصل کی جائے کہ ایسے نورانی اقوال میں ہی دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے۔

حوالہ جات

1۔الذاریات،56۔
2۔المجلسی، محمد باقر،(المتوفی1110ھ)، بحارالانوار، ناشر المطبعۃالاسلامیۃ ایران، تاریخ1385ھ، ج 4، ص 254 ۔
3۔الغزالی، اَبوحامد محمد بن محمد(المتوفی:505ھ)،کیمیای سعادۃ، ج1، ص57۔
4۔ابی الفتح، القاضی ناصح الدین ابی الفتح عبدالواحد بن محمد التمیمی(المتوفی510ھ)، غرر الحکم، دار الھادی، بیروت، لبنان۔
5۔عبدالعزیز الکرم، دیوان امام علی، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان۔
6۔النور،24۔
7۔فصلت،21۔
8۔یونس،92۔
9۔المؤمنون،50۔
10۔النحل،101۔
11۔النحل،78۔
12۔الجاویش، محمد اسماعیل الجاویش، من عجائب الخلق فی جسم الانسان، ص 116-117۔
13۔سورہ الملک،10۔
14۔سورہ انعام،36۔
15۔سورۃ الاعراف،100۔
16۔سورۃ الفرقان،44۔
17۔الکوثر فی تفسیر القرآن،http://www.balaghulquran.com/tafseer۔
18۔النابلسی، محمد راتب، آیات اللہ فی الانسان، الناشر موسوعۃ النابلسی للعلوم الاسلامیۃ، ص129۔
19۔الجاویش، محمد اسماعیل الجاویش، من عجائب الخلق فی جسم الانسان، ص117۔
20۔سورۃ الکہف،11۔
21۔الجاویش، محمد اسماعیل الجاویش، من عجائب الخلق فی جسم الانسان۔
22۔القبنجی، سید حسن، شرح رسالۃ الحقوق للامام زین العابدین، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات بیروت، لبنان، ج1، ص96- محمد علی سید، جسم کے عجائبات، الزھراء پبلشرز، ص 34۔

23۔ کریسی موریسون، العلم یدعوللایمان، منشویات دارالایمان، ص 44۔
24۔ کریسی موریسون، العلم یدعوللایمان، منشویات دارالایمان، ص 16۔
25۔الحجرات 12۔
26۔الکوثر فی تفسیر القرآن http://www.balaghulquran.com/tafseer۔
27۔ابی الفتح، القاضی عبدالواحد بن محمد التمیمی، غرر الحکم، حکمت 9657۔
28۔الاسراء 36۔
29۔الکوثر فی تفسیر القرآن۔
30۔فصلت،21۔
31۔نور،24۔
32۔الکوثر فی تفسیر القرآن۔
33۔القبنچی، سید حسن، رسالۃ الحقوق ج 1، ص95۔ طبع الاولی، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، لبنان۔
34سورۃ الاعراف، 204۔

علم کلام کے ارتقاء میں علماء تشیع کا کردار (۱)

The Role of Shia Theologists in the Evolution of the Theology

وقار حیدر نقوی
(فاضل جامعۃ الکوثر و متعلم حوزہ علمیہ نجف اشرف)

Abstract

The founder of any science has the utmost importance in the evolution and development of that science. This is because the thought and ideology of the founder becomes all about transmitting any knowledge from the darkness of non-existence to the light of existence. The seed of his profound thoughtfulness results into a grown tree in the shadow of which the seekers of knowledge find the serenity and peace. In this short research paper, effort is made to find out and to know about the originator of the Islamic Ilm al-Kalām (Theology). After presenting the various opinions found in this regard, the decisive opinion has been proved with arguments. The writings of prominent Shi'a intellectuals and scholars of the first, second and third centuries Hijri have been critically reviewed to know about their struggles and hardships in the evolution of Ilm al-Kalām (Theology).

Keywords: Role, Evolution, Shiit, Theology

مقدمہ

کسی بھی علم کا بانی اس علم کے ارتقا اور عروج کے سفر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے کہ مؤسس کی سوچ اور فکر ہی کسی بھی علم کو عدم کی تاریکیوں سے وجود کی روشنیوں کی طرف منتقل کرنے کا سبب بنتی ہے اور اس کی فکری گہرائی ہی وہ بیج ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ ایک تن آور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر علم کے متلاشی اسی درخت کے سائے میں علمی سکون حاصل کرتے ہیں۔ اس مختصر سے مقالے میں اسلامی علم کلام کے مؤسس اور بانی کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حوالے سے پائی جانے والی مختلف آرا کو پیش کرنے کے بعد فیصلہ کن رائے کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ دقت نظر

ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسلامی علم کلام کے بانی کو جاننے کے لیے اسے دو مراحل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱، اسلامی علم کلام کا لسانی مرحلہ۔ ۲۔ اسلامی علم کلام کا تحریری اور تدوینی مرحلہ۔

ان دو الگ مراحل میں علیحدہ طور سے اسلامی علم کے بانی کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے نمایاں شیعہ متکلمین اور علم کلام کے ارتقا میں ان کی تحریری کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ شیعہ علماء نے کس قدر زحمت اٹھا کر علم کلام کے ارتقا میں اپنا کردار ادا کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے اس موضوع پر وسیع تحقیقات موجود ہیں مثلاً طبقات المتکلمین، تاسیس شیعہ الکرام لعلوم الاسلام وغیرہ، لیکن ان کی طوالت عام طور سے قارئین کے مزاج پر گراں گزرتی ہے اس لیے اس موضوع پر ایک مختصر کاوش پیش کی جارہی ہے۔

کلام کی لغوی تعریف

کلام کا اطلاق منظم کیے گئے الفاظ اور معانی پر ہوتا ہے اور نحویوں کے نزدیک کلام کچھ اجزا یعنی اسم یا فعل یا حرف پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ اکثر متکلمین کے نزدیک صرف مرکب اور مفید جملے پر ہی کلام کا اطلاق ہوتا ہے۔[1]

علم کلام کی اصطلاحی تعریف

علم کلام کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے اہم تعریفیں پیش خدمت ہیں:

فارابی علم کلام کے بارے یوں رقمطراز ہیں: "علم کلام: وہ راسخ صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان کسی بھی قوم کے واضح اور محدود افعال و نظریات کی یاوری اور مخالف نظریات کو بے بنیاد قرار دینے پر قادر ہوتا ہے۔[2]

ابن خلدون علم کلام کے بارے میں لکھتے ہیں علم کلام ایسا علم ہے جو عقلی دلائل کی روشنی میں ایمانی عقائد کے اثبات اور عقائد میں اہل سنت و اسلاف کے نظریات سے منحرف اور بدعت گزار افراد کی رد پر مشتمل ہوتا ہے"[3]

عضد الدین الایجی علم کلام کے بارے میں ذکر کرتے ہیں: "علم کلام ایسا علم ہے جس کے ذریعے دینی عقائد کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے اور اشتباہات کو ختم کرنے پر قدرت حاصل کی جاتی ہے۔"[4]

جب کہ تفتازانی کے نزدیک علم کلام کی تعریف یہ ہے کہ: یقینی دلائل کے ذریعے حاصل ہونے والے دینی عقائد کے علم کو علم کلام کہا جاتا ہے"[5]

مذکورہ بالا تمام تعریفوں میں دو عنصر مشترک نظر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ علم کلام دینی عقائد کو دلائل کے ساتھ ثابت کرتاہےاور دوسرے یہ کہ دینی عقائد کے بارے میں پائے جانے والے اعتراضات کے جوابات بھی علم کلام ہی فراہم کرتاہے۔

اسلامی علم کلام کی ابتدا کے دوبنیادی مراحل

اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی علم کلام کا بانی کون تھا؟ علم کلام کے ماہرین کے درمیان شدید اختلاف واقع ہوا ہے۔ چنانچہ حقیقت حال سے آگاہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے کا بنظر غائر مطالعہ کیاجائے۔

دنیاکا کوئی بھی علم ایک منظم شکل اختیار کرنے سے پہلے غیر مرتب طور پر کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتاہےاور اس کے بارے میں مختلف انداز میں بحث کی جارہی ہوتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی بحث باقاعدہ طور سے ایک مرتب علم کی صورت میں رونماہوناشروع ہوجاتی ہیں۔ کچھ ایساہی معاملہ علم کلام کا بھی ہے۔ ابتدامیں یہ ایک باقاعدہ علم کی شکل میں موجود نہیں تھاالبتہ یہ علم لسانی سطح پر مکالمے، مباحثے، خطبے اور کبھی کسی اور بیانیے کی صورت میں اپنے ارتقا کے سفر کی راہوں پر گامزن تھااور بالآخر یہ زبان سے قرطاس پر منتقل ہوگیااوریوں علم کلام کتابی شکل میں وقوع پذیر ہونے کے بعداپنے تکامل کی منزلیں تلاش کرنے لگا۔ لہٰذا جب بھی علم کلام کے بانی اور موجد کے بارے میں تحقیق کرنامقصود ہوتو لسانی اور کتابی دونوں مرحلوں پر بحث کرناضروری ہوتاہے۔اس لیے سب سے پہلے لسانی مرحلے پراس کے بانی کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔

لسانی مرحلہ میں اسلامی علم کلام کے بانی:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی علم کلام کے لسانی مرحلے کے بانی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام بنیادی مباحث جوبعد میں باقاعدہ طور سے علم کلام کا حصہ بن گئے مختلف انداز میں لسان اقدس ختمی مرتبت سے صادر ہوچکے تھے۔ مثال کے طور پر یہاں اسلامی علم کلام کے بنیادی ترین مسئلہ "توحید" کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو پیش کرتے ہیں:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایاک نعبد وایاک نستعین یہ آیت ملحدین، فرقہ ثنویہ اور مشرکین کورد کرنے کیلئے نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا: ایاک نعبد پکاراکرو یعنی ہم صرف ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں، نہ کہ ملحدین کی مانند کہ جو کہتے ہیں کہ اشیاء کی کوئی ابتدا ہی نہیں بلکہ یہ

ازلی ہیں اور نہ ہی فرقہ تنویہ کی طرح جو کہتے ہیں کہ روشنی اور اندھیرا ہی اس کائنات کے مدبر ہیں اور نہ ہی مشرکین عرب کی طرح کہ جو کہتے ہیں کہ ہمارے بت ہی ہمارے معبود ہیں (بلکہ ہم تیرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور نہ ہی تیرے علاوہ کسی کو معبود پکارتے ہیں) اور نہ ہی یہود و نصاریٰ کی طرح کہ جو کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے (اے خدا تو اس سے بلند ہے کہ تیری اولاد ہو)"[6]

اس روایت سے باآسانی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم کلام کے اہم ترین مسئلہ توحید کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی آیت کو پیش فرمایا ہے لہٰذا لسانی سطح پر اسلامی علم کلام کے بانی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی قرار دیئے جاتے ہیں اور اسی طرح اسلامی علم کلام کے تمام مسائل کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دلائل کے ساتھ مختلف مقامات پر مورد بحث قرار دیا۔

حضرت علی علیہ السلام بطور متکلم

حضرت علی علیہ السلام نے اپنا سارا علم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل فرمایا یہاں تک کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایسے علم عطا فرمایا جیسے کوئی پرندہ اپنے بچے کو خوراک عطا کرتا ہے، اور ایک مقام پر آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے اور میں نے ہر باب سے ہزار باب کھولے۔ اور ان ہزار ابواب میں سے ایک باب علم کلام کا بھی تھا اور آپ علیہ السلام نے لسانی سطح پر علم کلام کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا فرمایا۔

تاریخ و سیرت کی کئی کتابیں آپ ع کے ان فرمودات اور واقعات سے لبریز ہیں جو آپ علیہ السلام کی شخصیت کے کلامی پہلو کو آشکار کرتی ہیں۔ ہم بطور نمونہ صرف ایک روایت کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آپ علیہ السلام وجود خدا پر برھان فطرت سے استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ "شمس و قمر، نباتات، درخت اور پانی کے بارے میں غور کرو۔ شب و روز کے پے درپے آنے جانے کے بارے میں غور کرو، ان دریاؤں، نہروں اور پہاڑوں کی کثرت اور ان کی لمبائی کے بارے میں غور کرو۔ مختلف زبان و کلام کے فرق کے بارے میں غور کرو۔ پس تباہی ہے اس انسان کے لیے کہ جو تقدیر ساز ہستی کا انکار اور مدبر کی نفی کرتا ہے۔[7]

کچھ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ ایسے پودوں کی طرح ہیں جن کا اگانے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کی مختلف صورتوں کو بنانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ جو دعویٰ کرتے ہیں اس پر دلیل نہیں رکھتے اور جو وہ سمجھتے ہیں اس کی تحقیق نہیں کرتے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی عمارت بغیر بنانے والے کے بن جائے یا کوئی جنایت بغیر کسی جنایت کرنے والے کے وقوع پذیر ہو۔

اس روایت سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرتے ہوئے علم کلام کو کس طریقے سے فروغ دیتے ہیں اور آپ علیہ السلام کس طریقے سے علم کلام کی ترقی کے لئے بنیادی موضوعات زیر بحث لائے۔ دیگر معصومین علیہم السلام بھی علم کلام کے ارتقا کے لیے مختلف انداز میں اپنا کردار ادا کرتے رہے بلکہ آپ نے اپنے شاگردوں کو بھی علم کلام سکھایا اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی تلقین کی۔

تحریری مرحلے میں علم کلام کا بانی

اگر اسلامی علم کلام کی دنیا میں سب سے پہلے مصنف کی بات کی جائے تو یہ مسئلہ تاریخ علم کلام میں شدید اختلاف کا سبب رہا ہے۔ اسلامی علم کلام میں سب سے پہلی کتاب کس نے لکھی؟ اس سوال کے جواب میں کئی آراء سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ آراء پیش خدمت ہیں اور اس کے بعد فیصلہ کن رائے پیش کی جائے گی۔

جلال الدین سیوطی رقمطراز ہیں کہ :

"ابو حذیفہ واصل بن عطا علم کلام کا سب سے پہلا مصنف ہے اور یہ وہ پہلا شخص تھا جسے معتزلی کا نام دیا گیا۔ "[8]

شیخ ابو جعفر طوسی لکھتے ہیں : کہ

"علی بن اسماعیل بن میثم تمار اور میثم امیر المومنین علیہ السلام کے جلیل القدر اصحاب میں سے تھے۔ یہ علی بن اسماعیل مذہب امامیہ کے سب سے پہلے متکلم ہیں اور آپ نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام آپ نے الکامل رکھا اور آپ کی ایک اور کتاب "استحقاق" بھی ہے۔"[9]

ابن ندیم لکھتے ہیں کہ :

"مذہب امامیہ کے سب سے پہلے متکلم علی بن اسماعیل بن میثم تمار ہیں اور میثم حضرت علی علیہ السلام کے جلیل القدر اصحاب میں سے ہیں. علی بن اسماعیل کی چند کتابیں ہیں: کتاب الامامۃ اور کتاب استحقاق" [10]-

علامہ حسن صدر عاملی فرماتے ہیں کہ :

"معلوم ہونا چاہیے کہ عیسیٰ بن روضہ تابعی، بنی ھاشم کے غلام، اور بو جعفر منصور کے ساتھی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ہیں اور آپ کی امامت کے موضوع پر ایک کتاب بھی موجود ہے اور عیسیٰ، منصور کے زمانے تک زندہ رہے۔"[11]

علامہ محسن امین رقمطراز ہیں کہ :" معلوم ہونا چاہیے کہ عیسیٰ بن روضہ تابعی، بنی ھاشم کے غلام اور ابو جعفر منصور کے ساتھی، علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ہیں اور آپ کی امامت کے موضوع پر ایک کتاب بھی موجود ہے اور عیسیٰ، منصور کے زمانے تک زندہ رہے۔ "[12] خلاصہ کلام یہ ہے کہ تین شخصیات کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ اسلامی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ہیں:

۱۔ابو حذیفہ واصل بن عطا معتزلی ۲۔ علی بن اسماعیل بن میثم تمار ۳۔ عیسٰی بن روضہ

البتہ علی بن اسماعیل کے بارے میں کیا جانے والا دعویٰ قدرے مختلف انداز میں ہے کیونکہ ابن ندیم اور شیخ طوسی نے آپ کے بارے میں دعویٰ کیا ہے کہ آپ مذہب امامیہ کے سب سے پہلے کلامی مصنف ہیں یعنی بطور مطلق یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ علی بن اسماعیل اسلامی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ہیں۔

بہر طور مناسب یہ ہے کہ جن حضرات کے بارے میں علم کلام کے پہلے مصنف ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے انکی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا جائزہ لیا جائے۔ لہٰذا جہاں تک تعلق ہے ابو حذیفہ واصل بن عطا کی تاریخ ولادت کا، تو زرکلی کا کہنا ہے کہ واصل بن عطا ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ جب کہ عیسیٰ بن روضہ کی تاریخ ولادت قرطاس تاریخ پہ معلوم نہیں ہو سکی اور انکی تاریخ وفات کے بارے میں بھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ آپ منصور عباسی کے دور تک بقید حیات تھے اور منصور عباسی ۱۳۶ھ میں بر سر اقتدار آیا۔ یعنی عیسٰی بن روضہ ۱۳۶ھ تک یقیناً زندہ تھے اور ایک عرصے تک آپ منصور عباسی کے دور میں زندہ رہے جیسا کہ نجاشی رقمطراز ہیں: " میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ منصور، عیسیٰ بن روضہ کی گفتگو توجہ سے سنا کرتا تھا اور یہ اس کا غلام تھا۔ عیسٰی بن روضہ کی امامت کے موضوع پر ایک کتاب ہے جس سے منصور بہت خوش تھا اور منصور، عیسٰی بن روضہ کا کلام پسند کیا کرتا تھا"۔[13] چونکہ (کان یستمع) ماضی کے استمرار پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عیسیٰ بن روضہ منصور عباسی کے دور میں کافی عرصہ تک زندہ رہے لیکن اس کے باوجود ان کی وفات کے بارے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اگر علی بن اسماعیل میثمی کی بات کی جائے تو ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے بارے میں بھی کوئی یقینی بات نہیں کی جا سکتی ہے البتہ کچھ محققین کا یہ کہنا ہے کہ آپ ۲۰۲ھ یا ۲۰۴ھ میں واصل حق ہوئے۔[14] لہٰذا معلوم ہوا کہ علی بن اسماعیل میثمی نے واصل بن عطا اور عیسیٰ بن روضہ کے تقریبا ۶۰ یا ۷۰ سال کے بعد وفات پائی اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ علی بن اسماعیل میثمی کے بارے میں علم کلام کا سب سے پہلا مصنف ہونے کا دعویٰ حقیقت سے کوسوں دور ہے اور ان کے بعد

علم کلام کے پہلے مصنف ہونے کا دعویٰ واصل بن عطا اور عیسیٰ بن روضہ کے درمیان دائر ہوتا ہے۔ اگر واصل بن عطا کی تاریخ وفات کی بات جائے تو آپ نے ۱۳۱ھ میں وفات پائی جب کہ عیسیٰ بن روضہ نے تقریباً ۱۳۶ھ میں دار فانی سے کوچ کیا۔

ان دونوں حضرات نے علم کلام کے موضوع پر کتابیں لکھیں لیکن یقین سے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے پہلے کتاب کس نے لکھی۔ البتہ علامہ حسن صدر عاملی نے دعویٰ کیا ہے: عیسیٰ بن روضہ، عمرو بن عبید اور واصل بن عطا سے مقدم تھے لیکن آپ نے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے۔[15]

لہٰذا عیسیٰ بن روضہ اور واصل بن عطاء معتزلی میں سے کسی ایک کو بھی اسلامی علم کلام کا پہلا مصنف قرار دینا قرین تحقیق نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلامی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ابو ھاشم بن محمد بن علی علیہ السلام بن ابی طالب علیہ السلام تھے کیونکہ آپ واصل بن عطا معتزلی کے استاد تھے اور ابو ھاشم کے بارے میں تمام اہل تشیع اور اہل تسنن کا اتفاق ہے کہ آپ اپنے دور میں علم کلام کے امام تھے۔[16] یعنی ابو ھاشم اپنے دور میں علم کلام کے حوالے سے سب سے بڑی شخصیت تھے اور آپ نے ۹۸ھ یا ۹۹ھ میں وفات پائی۔[17]

دوسری طرف ابن قتیبہ نے صراحت کے ساتھ ابو ہاشم کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ نے کئی کتابیں لکھیں اور اپنی وفات سے پہلے آپ نے یہ کتابیں محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس کے حوالے کر دی تھیں اور ابن قتیبہ کے الفاظ ہیں: کہ "جہاں تک ابو ہاشم کا تعلق ہے تو آپ ایک عظیم المرتبت انسان تھے اور شیعہ آپ کی پیروی کیا کرتے تھے۔ آپ نے شام میں وفات پائی۔ آپ نے محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس کو وصیت کی اور ابو ھاشم نے محمد بن علی سے فرمایا کہ آپ اس امر (دین) کے ذمہ دار ہیں اور یہ معاملہ آپ کی نسل میں رہے گا اور پھر ابو ھاشم نے اپنی چند کتابیں محمد بن علی کے حوالے کیں اور شیعوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا اور جناب ابو ھاشم کی کوئی اولاد نہیں تھی"۔[18]

اگرچہ ابن قتیبہ نے صراحت کے ساتھ یہ ذکر نہیں کیا کہ ابو ہاشم علم کلام کے سب سے پہلے مصنف تھے لیکن چند ایک قرائن کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ابو ہاشم ہی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف تھے:

۱۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ابو ہاشم بالاتفاق علم کلام کے امام قرار دیئے جاتے ہوں اور آپ نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں ہوں لیکن ان میں سے کوئی کتاب بھی علم کلام کے موضوع پر نہ ہو؟

۲۔ ابو ہاشم نے اپنی وصیت میں محمد بن علی سے فرمایا تھا: ''انت صاحب ھذا الامر''یعنی آپ ہی امر دین کے ذمہ دار ہیں اور پھر چند کتابیں محمد بن علی کے حوالے کیں اور اپنے شیعوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا۔

اب یہ تصور کرنا انتہائی بعید ہے کہ وصیت تو دین کے معاملے میں ذمہ داری کے حوالے سے ہو لیکن حوالے کی جانے والی کتابوں سے متعلق وصیت نہ ہوں۔ اسی طرح یہ تصور کرنا بھی انتہائی بعید ہے کہ ان کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب علم کلام کے متعلق نہ ہو جب کہ آپ بالاتفاق علم الکلام کے سب سے بڑے ماہر بھی قرار دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے "کتبہ "یعنی یہ کتابیں خود ابو ہاشم کی اپنی تصنیف کردہ تھیں ورنہ "کتبا" بھی کہا جا سکتا تھا اور کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی علم کا ماہر کئی کتابوں کا مصنف تو ہو لیکن وہ اپنے تخصصی علم پر کوئی کتاب نہ لکھے ؟

لہذا ان قرائن کی روشنی میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف کا نام ابو ہاشم تھا اور آپ کا تعلق مذہب تشیع سے تھا۔ یہاں تک کے معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ لسانی سطح پر اسلامی علم کلام کے بانی رسول خدا حضرت محمدؐ تھے اور تحریری سطح پر اسلامی علم کلام کے بانی جناب ابو ھاشم جو اہل تشیع کے مشہور عالم اور واصل بن عطاء معتزلی کے استاد تھے۔

یہ جاننے کے لیے کہ اسلام میں علم کلام موضوعات اور منہج کے لحاظ سے کن مراحل سے گزرا؟ ان مراحل کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ مراحل تسلسل کے ساتھ ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

آغاز اسلام سے لے کر اسلامی علم کلام کی تدوین تک اسلامی علم کلام کا موضوعاتی اور منہجی پس منظر

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام علوم کتابی شکل میں منتقل ہونے سے پہلے بحث و تمحیص اور مباحثہ و مکالمہ کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اور ان علوم میں غیر منظم طور سے ارتقاء وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ باقاعدہ منظم اور مرتب علوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور علوم کی ترتیب و تنظیم سے پہلے مختلف علوم دوسرے مختلف علوم، کے ساتھ مخلوط ہوتے ہیں اور ظاہری طور سے ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اگر اسلامی علم کلام کی بات کی جائے تو یہ بھی اپنے آغاز میں بحث و مباحثہ اور گفت و شنید کی صورت ہی میں زندہ تھا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد مختلف افراد آپ سے علم کلام کے مختلف موضوعات پر سوالات اور اعتراضات کیا کرتے تھے۔ ان میں بڑی تعداد کفار، مشرکین اور یہودی و نصاریٰ کی ہوا کرتی تھی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ مناظرے کیے اور انکے جوابات میں دی گئیں آپ کی براھین کتب سیرت و تاریخ کا آج بھی حصہ ہیں۔ ان میں سے چند کے بارے میں آئندہ صفحات میں بحث ہو گی۔ رسول خدا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال پر ملال کے بعد سے تقریباً دوسری صدی ہجری کے آغاز تک علم کلام کے مختلف موضوعات پر

مباحثوں، مناظروں اور سوالات وجوابات واعتراضات کی صورت میں بحث ہوتی رہی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موضوعات تبدیل ہوتے رہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد سے لے کر دوسری صدی ہجری کے آغاز تک زیر بحث آنے والا سب سے پہلا کلامی مسئلہ، امامت و خلافت کا مسئلہ تھا۔ جیسا کہ شہرستانی اسکے بارے میں صراحت سے کہتے ہیں: مسئلہ امامت میں اختلاف امت کا سب سے بڑا اختلاف ہے۔[19]

جعفر سبحانی لکھتے ہیں: ابوالحسن اشعری کہتا تھا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں میں ہونے والا سب سے پہلا اختلاف، مسئلہ امامت پر اختلاف تھا۔

مسئلہ امامت کے حوالے سے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہانے مختلف مقامات پر اور مختلف انداز سے روشنی ڈالی اور دیگر ائمہ علیہم السلام نے بھی اس کلامی مسئلہ پر مختلف انداز سے بات کی اور اسی طریقے سے مختلف اصحاب بھی مختلف انداز میں اس کلامی مسئلے کو زیر بحث لاتے رہے ہیں جس کی وجہ سے ان اصحاب کو پہلی صدی ہجری کے شیعہ ماہرین علم کلام میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام تک مسئلہ امامت ایک اہم کلامی مسئلہ تو تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے کلامی موضوعات بھی زیر بحث آتے رہے اور ان موضوعات کے حوالے سے اہلبیت علیہم السلام اپنا موقف پیش فرماتے رہے اور اپنے اصحاب کو بھی ان موضوعات پر گفتگو کرنے کے حوالے سے تعلیمات مرحمت فرماتے رہے۔ آنے والے صفحات میں پہلی صدی ہجری کے شیعہ متکلمین میں سے کچھ کا ذکر کیا گیا ہے اور بطور نمونہ ان کے کلامی موضوعات پر کی گئی بحث کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اسلامی علم کلام کی تدوین سے لے کر ولادت امام عصر (عج اللہ) تک شیعہ علم کلام کا موضوعاتی اور منہجی پس منظر

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں علم کلام کو باقاعدہ طور پر تحریری شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ علم کلام کو تحریری شکل میں منتقل کرنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ علم کلام تحریری شکل کے علاوہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔

دوسری صدی ہجری سے لے کر غیبت صغریٰ کے آغاز تک 155 سالہ زمانہ شیعہ علم کلام کے ارتقا میں ایک خاص اہمیت کا حامل اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں ائمہ علیہم السلام موجود تھے جن سے براہ راست عقیدے کا حصول اور درستگی

ممکن تھی۔اس عرصے کو موضوعات کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بطور کلی مسئلہ امامت ہی وہ کلامی موضوع رہا جس پر تحریر و تقریر کی صورت میں بحث کی گئی۔لیکن مسئلہ امامت کے علاوہ دوسرے بھی کئی موضوعات اس دور انیے میں زیر بحث رہے۔جب غیر مسلموں یعنی ثنونیۃ،مانویۃ،زنادقہ اور براھمۃ سے بحث ہوتی تو توحید،صفات خدا کے معانی اور نبوت کی ضرورت وغیرہ جیسے موضوعات پر بات کی جاتی۔

لیکن وہ کلامی موضوعات جن پر مسلمان آپس میں بحث و تمحیص کرتے ان میں سے اہم ترین موضوع مسئلہ امامت ہی تھا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ جبر و اختیار، حقیقت ایمان، مرتکب کبیرۃ کا حکم، خلق القرآن وغیرہ جیسے موضوعات بھی زیر بحث آئے۔اور اہل تشیع آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف اور مباحثہ کرتے تو وہ اہل بیت علیہم السلام کی شان میں غلو کا مسئلہ زیر بحث لاتے۔[20] اگر اس عصر کو کلامی منہج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عصر میں شیعہ متکلمین عقل سے زیادہ نقل اور نص کا استعمال کرتے اور اسی پر اعتماد بھی کرتے تھے۔اس کی بنیادی وجہ عقیدہ عصمت اور امام معصوم علیہم السلام کا حامل علم الٰہی ہونا ہے۔ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جہاں پر انسان کی عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے وہاں الہامی عقل اور شعور پھر بھی محو پرواز رہتا ہے۔جیسا کہ جب ہشام ابن حکم کا ابوالہذیل علاف سے مناظرہ شروع ہونے لگا تو ابوالہذیل نے کہا: ہم دونوں اس شرط پر مناظرہ کرتے ہیں کہ اگر آپ جیت گئے تو میں آپ کا مذہب مانوں گا اور اگر میں جیت گیا تو آپ میرا مذہب اختیار کر لیں گے۔

اس کے جواب میں ھشام ابن حکم نے کہا: آپ نے انصاف نہیں کیا۔میں آپ کے ساتھ مناظرہ اس شرط پر کروں گا کہ اگر میں جیت گیا تو آپ میرا مذہب مان لیں گے اور اگر آپ جیت گئے تو میں اپنے امام کی طرف (حق جاننے) کے لیے رجوع کروں گا۔بلکہ روایت میں ہے: امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے شاگردوں کو ارشاد فرمایا کرتے تھے: اثر (یعنی قرآن و حدیث کے مطابق) کلامی مباحث پر بات کیا کرو۔[21]

امام عصر کی ولادت باسعادت سے لے کر آغاز غیبت کبریٰ تک (255تا329ھ) اسلامی علم کلام کا موضوعاتی اور منہجی پس منظر

غیبت صغریٰ کے آغاز کے ساتھ ہی شیعہ متکلم کو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر آزمائش کا سامنا تھا۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام علیہ السلام کے بھائی جعفر بن علی نے بھی دعویٰ امامت کر دیا تھا جس کے بعد شیعہ تشویش میں مبتلاء ہو گئے اور جب امام عصر علیہ السلام غیبت صغریٰ پر تشریف لے گئے تو جن اہم موضوعات پر شیعہ متکلمین نے بحث کی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

1۔ اثبات وجود امام مھدی علیہ السلام

2۔ کیا امام علیہ السلام عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود امام بن سکتے ہیں۔

3۔ جعفر بن علی کے دعویٰ امامت کے جوابات

4۔ غیبت کا فلسفہ اور فائدہ۔

5۔ خبر واحد کی حجیت اور اس پر عمل۔

6۔ فکری، نفسیاتی اور اجتماعی طور سے امام علیہ السلام کی غیبت کبریٰ کے لیے آمادگی وغیرہ۔

دوسری طرف خارجی محاذ پر شیعہ متکلمین کو معتزلہ اور زیدیہ متکلمین کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا اور بطور کلی اس 74 سال کے عرصے میں بھی امامت کا موضوع مختلف زاویوں سے زیر بحث رہا۔ جہاں تک تعلق ہے طرز استدلال کا تو اس زمانے میں عقل سے زیادہ نقل پر ہی اعتماد کرنے کا رواج تھا۔ اگرچہ بعض مقامات پر عقل کو بطور مددگار استعمال کیا جاتا رہا--[22]

اس کے بعد غیبت کبریٰ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس زمانے کو علم کلام کے آغاز عروج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں شیعہ علم کلام مرتب اور منظم طور پر تدوین ہوا۔ علم کلام کے تمام موضوعات کو ایک ہی کتاب کی شکل میں مدون کر کے اس پر بحث کا آغاز ہوا۔ جبکہ اس سے پہلے زمانے میں علم کلام کے موضوع پر الگ الگ کتابچے اور دستاویزات لکھیں گئیں۔ اس عصر کے آغاز میں جناب صدوق نے علم کلام میں قابل ذکر کام کیا اور علم کلام کے مختلف موضوعات کو ایک ہی کتاب میں زیر بحث لانے کی طرح ڈالی۔

اسی عصر میں جناب صدوق کے بعد قابل ذکر شخصیت جناب مفید منظر عام پر آئے۔ آپ نے شیعہ علم کلام کے ارتقاء میں کلیدی کردار ادا کیا۔ آپ نے علم کلام کے موضوعات پر کئی کتب تصنیف فرمائیں اور یوں آپ مجموعی طور پر تقریباً ۲۰۰ کتب کے مصنف قرار پائے۔ ان میں سے ۷۵ فیصد کتب علم کلام کے موضوع پر ہی لکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ پہلی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں شیعہ علم کلام کے استدلات میں نص کا رنگ غالب نظر آتا ہے اور عقل کو مرکزیت نہیں دی جاتی۔ صرف چند علماء کرام کی جانب سے عقلی دلائل علم کلام کی تاریخ میں نقل کیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ علامہ صدوق کے دور تک جاری رہا اور علامہ صدوق نے تمام کلامی موضوعات پر نقل کے ذریعے ہی استدلال کیا۔

لیکن شیخ مفید نے علم کلام کے نصی منہج پر اعتراض کیا اور کلامی موضوعات پر عقلی استدلال کو بھی جگہ دی۔ جناب مفید نے اس دور میں علم کلام کو ایک نئے عقلی زاویے سے دیکھا اور اس پر بیش بہا علمی کام کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نئے کلامی

زاویے کی ترویج کی خاطر شاگرد بھی تیار کیے۔ جن میں شریف رضی، سید مرتضی علم الہدیٰ، ابوالفتح الکراجکی نمایاں ترین شخصیات ہیں۔

علامہ شیخ مفید اور ان کے شاگردوں کی محنتوں کے نتیجے میں علم کلام کی دنیا میں ایک نیا مکتب وجود میں آیا جسے مکتب بغدادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی مکتب کی ترقی یافتہ شکل مکتب حلہ ہے اور اس مکتب فکر نے عقل کو نئے انداز سے کلامی ابحاث میں استعمال کیا اور اس مکتب عقل کے استعمال کا رنگ مکتب بغدادی میں عقل کے استعمال سے کہیں زیادہ تھا۔

لسانی سطح پر اسلامی علم کلام کے ارتقاء میں پہلی صدی ہجری کے شیعہ متکلمین کا کردار

اب ہم جلیل القدر اصحاب میں سے ان اصحاب کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے لسانی سطح پر علم کلام کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ پہلی صدی ہجری کے وہ جلیل القدر اصحاب جنہوں نے لسانی سطح پر علم کلام کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا:

ا۔ خالد بن سعید بن العاص الاموی المتوفی ۱۴ ھ: خالد بن سعید بن العاص بن امیہ بن عبد شمس جلیل القدر صحابی اور عظیم مرتبہ پر فائز شخصیت تھے۔ آپ اصحاب میں سب سے پہلے صحابی تھے جنہوں نے لسانی سطح پر علم کلام کے اہم ترین مباحث کو زیر گفتگو قرار دیا۔ آپ وہ سب سے پہلے صحابی تھے جنہوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کا انکار کیا اور سب سے پہلے اس بات پر حضرت ابو بکر کے سامنے احتجاج کیا۔ اور اس بات کو صراحت سے بیان کیا کہ خلافت کے مستحق صرف حضرت علیؑ ہی ہیں اور حضرت ابو بکر کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا۔

جیسا کہ شیخ ابو علی فرماتے ہیں کہ خالد بن سعید وہ سب سے پہلے صحابی تھے کہ جو جمعہ کے روز حضرت ابو بکر کے سامنے کھڑے ہوئے اور خداوند متعال کی حمد و ثنا بجالانے کے بعد آپ نے فرمایا:

"اے ابو بکر اللہ سے ڈرو اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں جو فیصلہ پہلے ہو چکا ہے اس میں غور و فکر کرو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا تھا اور ہم سن رہے تھے اور آپ بھی ہمارے ساتھ تھے کہ جب ہم غزوہ بنی قریظہ میں موجود تھے جس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے بنی قریظہ کے بڑی تعداد میں افراد کو واصل جہنم کیا تھا۔ اس موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: اے قریش! میں آپ کو ایک وصیت کر رہا ہوں۔ اس وصیت کی حفاظت کرنا اور آپ کے حوالے ایک اہم معاملہ کر رہا ہوں، اسے ضائع مت کرنا۔ اور وہ یہ کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب آپ کے لیے میرے بعد میری طرف سے امام ہیں اور آپ میرے خلیفہ ہیں اور یہ بات جبرائیل نے مجھے اللہ کی طرف سے پہنچائی ہے"۔

اس واقعے کے بعد یہ خبر عمر بن خطاب تک پہنچی اور حضرت عمر بن خطاب نے خالد بن سعید اور بعض دیگر اصحاب کو حاضر کیا اور ان سے کہا: اے اصحاب علیؑ! اگر آپ میں سے کسی ایک نے بھی وہ بات کی کہ جو خالد بن سعید نے کل کی تھی تو میں اس کی آنکھیں نکال لوں گا۔

جناب خالد بن سعید حضرت عمر بن خطاب سے مخاطب ہوئے اور فرمایا؛ اے عمر بن خطاب کیا تم اپنی تلواروں کی وجہ سے ہمیں دھمکی دے رہے ہو یا اپنی قسمت کی وجہ سے۔ یاد رکھو! ہماری تلواریں آپ کی تلواروں سے زیادہ تیز ہیں اور ہمارے درمیان ذوالفقار موجود ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی تلوار ہے۔ اگرچہ ہم کم ہیں لیکن تمہاری کثرت اللہ کے نزدیک قلت ہے۔ اس لئے کہ ہمارے درمیان حجت خدا اور اللہ کے رسول کے وصی موجود ہیں۔ اگر میں اپنے امام کی بات کا پابند نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار نکالتا اور اللہ کے راستے میں یہاں تک جہاد کرتا کہ میں اپنا کوئی عذر باقی نہ چھوڑتا"۔[23]

۲۔ سلمان الفارسی المتوفی ۳۴ھ: آپ ابو عبد اللہ، سلمان فارسی کے نام سے معروف تھے۔ آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم صحابی تھے۔ جب آپ نے اسلام کے بارے میں سنا تو بلاد فارس کو چھوڑ کر عربستان کی طرف ہجرت فرما گئے اور قبول اسلام کے بعد آپ شریعت اسلامی کے مضبوط عالم دین قرار پائے۔ جبکہ قبول اسلام سے پہلے آپ نے کئی ادیان اور ثقافتوں کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ آپ کو تعلیم و تعلم کے ساتھ بہت شغف تھا۔ آپ پہلی صدی ہجری کے اہم شیعہ متکلمین میں سے شمار ہوتے تھے۔

آپ حضرت علیؑ کے استحقاق خلافت کے حوالے سے آپ کے علم، فضل اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت کے ذریعے استدلال کیا کرتے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابو بکر کی بیعت سے انکار کیا اور حضرت علی علیہ السلام کی امامت پر استدلال کرتے ہوئے آپ نے یوں فرمایا تھا:

"آپ کے پاس اس (حضرت علیؑ) پر سبقت لے جانے پر کیا دلیل ہے جو آپ سے زیادہ صاحب علم اور آپ سے زیادہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قریبی اور آپ سے زیادہ اللہ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی تاویل سے آگاہ ہے اور آپؑ وہ ہیں جن کے پاس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں خود چل کر آیا کرتے تھے آپ ہی کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت آپ کو وصیت فرمائی تھی"۔[24]

۳۔ مقداد بن عمر بن ثعلبہ البھرانی المتوفی ۳۳ھ: مقداد بن عمر بن ثعلبہ بن مالک البھرانی القضاعی مقداد ابن اسود کے نام سے معروف تھے۔ آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہادر ترین اصحاب میں سے تھے۔ آپ پہلی صدی ہجری کے شیعہ متکلمین میں سے ایک تھے جنہوں نے مسئلہ امامت کے بارے میں لسانی سطح پر بحث کی۔ آپ کے بارے میں ذکر کیا جاتا ہے

کہ آپ کے لیے مسجد نبوی میں ایک خاص مقام تھا جہاں پر آپ بیٹھا کرتے اور لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل پڑھتے اور لوگوں کے سامنے ان کی عظمت بیان کرتے تاکہ لوگ صحیح راستے پر چل سکیں۔25.

جب عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کی بیعت کی تو حضرت مقداد نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا: "عبدالرحمن آگاہ رہو! خدا کی قسم! آپ نے حضرت علی علیہ لسلام کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ ایسے لوگوں میں سے ہیں کہ جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں اور عدل کے ساتھ حکم دیتے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو عظمت اہلبیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کی گئی وہ عظمت کسی اور کو عطا نہیں کی گئی۔ پھر عبدالرحمان بن عوف کہنے لگا: مجھے خوف ہے کہ تم کہیں صاحب فتنہ و افتراق نہ بن جاؤ تو حضرت مقداد نے جواب دیا: وہ شخص جو حق اور اولی الامر کی اطاعت کی طرف بلاتا ہے وہ صاحب فتنہ نہیں ہوتا بلکہ جو لوگوں کو باطل میں داخل کر دے اور حق پر باطل کو ترجیح دے وہ شخص ہی صاحب فتنہ اور صاحب افتراق ہوتا ہے". [26]

۴۔ جندب بن جنادہ الغفاری المتوفی 36ھ: جناب جندب بن جنادہ، ابوذر غفاری کے نام سے معروف تھے اور آپ عظیم المرتبت اصحاب میں سے ایک تھے۔ آپ خداوند کے وجود اور وحدانیت کے بارے میں اعتقاد اسلام کے ظہور سے پہلے بھی رکھتے تھے اور آپ بتوں کی پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ وہ صحابی ہیں جنہوں نے علم کلام کے اہم ترین مسئلہ امامت کے حوالے سے مختلف لوگوں کے ساتھ ابحاث کیں۔ آپ لوگوں کی رہنمائی صراط حق و ولایت کی طرف فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا شمار ان اصحاب میں ہوتا تھا جو لسانی سطح پر علم کلام کے اہم ترین مباحث زیر بحث لائے۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے منکرین کے ساتھ کئی مباحث فرمائیں۔ ہم ان میں سے صرف ایک کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے امت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حیرت زدہ امت! آگاہ رہو اگر آپ نے اسے مقدم کیا ہوتا جسے اللہ نے مقدم کیا تھا اور اسے موخر کیا ہوتا جسے اللہ نے موخر کیا تھا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کی وراثت اور ولایت کا اقرار کرتے اور اللہ کے فرائض میں سے کوئی حصہ بھی نظر انداز نہ ہوتا اور کوئی بھی دو افراد اللہ کے حکم میں اختلاف نہ کرتے مگر یہ کہ آپ کو اللہ کی کتاب اور سنت میں سے اہل بیت علیہم السلام کے نزدیک اس حکم کا علم ہو جاتا. [27]

۵۔زید بن صوحان العبدی المتوفی ۳۶ھ: زید بن صوحان العبدی معروف صحابی جناب صعصعہ بن صوحان کے بھائی تھے۔جناب صعصعہ بن صوحان عظیم عبادت گزار مجاھد اور خطیب تھے۔آپ مسئلہ امامت میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کو باقی تمام لوگوں پر افضل گردانتے اور لوگوں کو جناب امام علی علیہ السلام کی اتباع کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔آپ کا شمار پہلی صدی ہجری کے ان متکلمین میں ہوتا ہے جو گفتگو کی صورت میں علم کلام کے مسائل بیان کیا کرتے تھے۔سیرت و تاریخ کی کتابوں میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آپ علم کلام کے ماہرین میں سے ایک تھے۔

ہم یہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں آپ نے مسئلہ امامت کے حوالے سے گفتگو فرمائی کہ والی کوفہ ابوموسیٰ اشعری لوگوں کو حضرت علی ع سے دور کرنے والی باتیں کر رہا تھا کہ جناب زید کھڑے ہوگئے اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو بلند کر کے فرمایا: اے عبداللہ بن قیس! فرات کو اپنے راستوں پر لوٹاؤ اور اسے اس طرف لوٹادو جہاں سے یہ آتا ہے تاکہ یہ وہاں سے لوٹ آئے جہاں سے یہ نمودار ہوتا ہے۔کیا جو تم چاہتے ہو وہ کر سکتے ہو؟ تو پھر وہ چیز چھوڑ دو جو تمھارے بس میں نہیں۔(تو پھر) امیر المومنین سید المسلمین ع کی طرف چلو اور اگر آپ سب لوگ حضرت علی علیہ السلام کی طرف نکل پڑو تو حق پالو گے۔[28]

۶۔مالک اشتر المتوفی ۳۸ھ: مالک بن الحارث النخعی الاشتر جلیل القدر تابعی تھے۔آپ کی ولادت ظہور اسلام سے پہلے ہوئی اور آپ رسول اللہ ص کے زمانے میں موجود تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے شرفیاب نہ ہوسکے۔مالک اشتر انتہائی بہادر اور فصیح و بلیغ خطیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاندار متکلم بھی تھے۔آپ کے خطبوں اور اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ علم کلام میں کس نقطہ نظر کے حامی تھے۔آپ اکثر اوقات اپنے اشعار و خطبات میں مسئلہ امامت پر بحث کیا کرتے تھے۔

ہم یہاں ایک خطبے کو ذکر کرتے ہیں جس میں آپ نے لوگوں کے سامنے جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کے فضائل سنا کر انہیں حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے کی ترغیب دلائی۔

یعقوبی لکھتا ہے کہ "جناب مالک اشتر لوگوں کو حضرت علیؑ کی بیعت کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمارہے تھے: اے لوگو! حضرت علیؑ وصی الاوصیاء اور انبیاءؑ کے علم کے وارث ہیں۔آپ بڑی آزمائش والے اور اچھی طرح بے نیاز ہیں۔آپ کے ایمان کی گواہی قرآن مجید نے دی ہے اور آپ کی جنت کی بشارت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے اور آپ وہ ہستی ہیں کہ جن میں تمام فضائل کامل ہو چکے ہیں۔آپ کی افضلیت اور علم و فضل میں اولین و آخرین میں سے کوئی بھی شک نہیں کر سکتا"[29]

۷۔ حجر بن عدی الکندی المتوفی ۵۱ھ: آپ ابن جبلہ بن عدی بن ربیعہ الکندی حجر الخیر کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا تھا۔ جناب حجر انتہائی بہادر، مجاہد اور انقلابی شخصیت کے حامل مخلص شیعیان علی علیہ السلام میں سے تھے۔[30]

آپ نے ولایت امیر المؤمنین علیہ السلام کے دفاع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور کئی مقامات پر جناب علی علیہ السلام کی ولایت بر حق کو دلائل سے ثابت کرتے رہے۔ اس اعتبار سے آپ کا شمار بھی پہلی صدی ہجری کے ان شیعہ متکلمین میں ہوتا ہے جو گفتگو کی صورت میں علم کلام کے کئی مسائل زیر بحث لائے۔ بطور مثال ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے۔

مغیرہ بن شعبہ (والی کوفہ) معاویہ کی وصیت کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کی شان میں گستاخی سے دستبردار نہیں ہوا تو ایک مرتبہ حضرت حجر بن عدی کھڑے ہوئے اور فرمایا: اللہ تمہاری مذمت کرتا ہے اور تم پر لعنت بھیجتا ہے۔ بیشک اللہ فرماتا ہے: یَآَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ وَلَوْعَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ [31]

اے ایمان والو انصاف کے سچے داعی بن جاؤ اور اللہ کے لئے گواہ بنو اگرچہ وہ گواہی تمہاری ذات یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ جن کی تم مذمت کرتے ہو وہ ان سے زیادہ حامل فضیلت ہیں جن کی تم ثناء خوانی کرتے ہو"۔

۸۔ صعصعۃ بن صوحان المتوفی ۵۱ھ: آپ ابن حجر بن الحارث العبدی کے نام سے بھی یاد کیے جاتے تھے۔ جناب صعصعۃ بن صوحان حضرت علی علیہ السلام کے عظیم اصحاب میں سے ہیں۔ آپ خطیب بے بدل، فصاحت وبلاغت کا نمونہ، قادر الکلام اور جرات مندی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔[32] آپ پہلی صدی ہجری کے مشہور متکلمین میں سے ایک تھے۔ آپ نے کئی مقامات پر مسئلہ امامت پر دلائل سے گفتگو فرمائی۔

۹۔ قیس بن سعد بن عبادۃ الخزرجی المتوفی ۵۹ھ: حضرت قیس کا پورا نام ابن عُبادۃ بن دلیم بن حارثہ الانصاری الخزرجی الیمنی تھا۔ حضرت قیس بن سعد عمدہ گھوڑ سوار، بہادر، خطیب اور قادر الکلام مناظر تھے۔ آپ نے علم الکلام میں مسئلہ امامت کے حوالے سے کئی مقامات پر اپنے دلائل پیش کیے اور امامت امیر المومنینؑ کی حقانیت کے بیان میں کوئی لمحہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہیں پہلی صدی ہجری کے ان شیعہ متکلمین میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے لسانی طور سے علم کلام کے مسائل پر بات کی ہے۔

بطور مثال ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے یعقوبی رقمطراز ہے کہ "جب معاویہ نے مسند بادشاہت سنبھالی اور لوگوں کو اپنی بیعت کرنے کے لیے جمع کیا تو اس موقع پر حضرت قیس نے فرمایا:

اے معاویہ! میں آج کے دن سے شدید نفرت کرتاہوں۔

پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: آپ شر کو خیر پر ترجیح دے رہے ہیں۔ عزت کو ذلت میں بدل رہے ہیں اور کفر کو ایمان میں تبدیل کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تم ولایت امیر المومنین علیہ السلام کے بعد کر رہے ہیں حالانکہ وہی مسلمانوں کے سردار اور رب العالمین کے رسول کے چچازاد ہیں"۔[33]

۱۰۔ میثم التمار المتوفی ۶۰ھ: حضرت میثم تمارؒ کا پورا نام میثم بن یحیٰ الاسدی الکوفی تھا۔ آپ بنی اسد کی ایک خاتون کے غلام تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے آپ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ آپ حضرت علی علیہ السلام کے بہت قریب ہو گئے اور آپ علیہ السلام سے کئی علوم و معارف حاصل کیے اور جناب امیر المؤمنین علیہ السلام نے کئی رازوں سے صرف حضرت میثم کو ہی مطلع فرمایا۔

حضرت میثم تمار بسا اوقات اس وقت بھی حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ ہوتے تھے جب آپ علیہ السلام تنہائیوں میں اپنے رب سے راز و نیاز کے لیے راتوں کو صحرا کا رخ فرماتے تھے۔ آپ اپنے دور کے مشہور متکلمین میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت میثم تمار مسئلہ امامت امام علی علیہ السلام کے حوالے سے علم کلام زیر بحث لایا کرتے تھے۔ آپ کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے جہاں آپ نے خطرناک ترین ماحول میں بھی مسئلہ امامت پر گفتگو کرنے سے گریز نہ کیا۔ اس کی ایک واضح مثال وہ موقع ہے جب آپ کو کھجور کے درخت پر سولی پر چڑھایا گیا تو آپ نے اس مقام پر بھی حضرت علی علیہ السلام کے فضائل اور آپ علیہ السلام کے عدل پر گفتگو کی۔[34]

۱۱۔ عدی بن حاتم الطائی المتوفی ۶۷ھ: حضرت عدی بن حاتم الطائی کا مکمل نام ابن عبداللہ بن سعد بن حشرج الطائی تھا۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم صحابہ میں سے ایک تھے۔ اپنے قبیلے کے سردار ہونے کے ساتھ ساتھ خطیب، شاعر اور حاضر جواب مناظر بھی تھے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ امامت کے حوالے سے علم کلام پر بات کی اور کئی مقامات پر دلائل کی روشنی میں اس مسئلہ کو ثابت کرتے رہے۔

جیسا کہ ایک دفعہ حضرت علی علیہ السلام نے آپ کو معاویہ کی طرف بھیجا تو آپ نے معاویہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ہم آپ کو امیر خداوند کی طرف بلانے آئے ہیں۔ وہ امیر جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہماری بات اور ہماری امت کو جمع فرمایا ہے۔ ہمیں آپس میں صلح کرنی چاہیے (مگر اس شرط کے ساتھ کہ) حضرت علی علیہ السلام مسلمانوں کے سردار اور ان سب سے برتر ہیں....[35]

۱۲۔ عبداللہ بن عباس بن عبد المطلب المتوفی ۶۸ھ: حضرت عبداللہ بن عباس بن عبد المطلب بن ہاشم جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ فقیہ، محدث، شاعر، قادر الکلام مناظر اور حضرت علی علیہ السلام کے شاگردان میں سے تھے۔ (طبقات المتکلمین جلد 1، ص 289) آپ نے مختلف خطبوں، مناظروں اور اشعار کی صورت میں شیعہ علم کلام کے اہم موضوع مسئلہ امامت علی علیہ السلام کے بارے میں گفتگو فرمائی۔

۱۳۔ کمیل بن زیاد المتوفی ۸۲ھ: حضرت کمیل بن زیاد کو ابن نھیک بن ھیثم النخعی الصھبانی الکوفی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔[36] آپ حضرت علی علیہ السلام کے عظیم صحابی، نیکوکار، عبادت گزار اور مجاھد انسان تھے آپ نے لوگوں کو حق کی جانب رغبت دلانے کی خاطر کئی مقامات پر مسئلہ امامت پر بات کی۔ اس لیے آپ کو پہلی صدی ہجری کے مشہور شیعہ متکلمین میں شمار کیا جاتا ہے۔[37]

جب حجاج بن یوسف ثقفی نے کوفہ کو فتح کیا تو اس موقع پر حضرت کمیل اور حجاج کے درمیان گفتگو ہوئی جس میں آپ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے اثبات میں دلائل دیئے اور جب حجاج اور اسکے ساتھی ان دلائل کا جواب نہ دے سکے تو حجاج نے حضرت کمیل کا سر قلم کرنے کا حکم صادر کر دیا۔[38]

تحریری سطح پر اسلامی علم کلام کے ارتقاء میں دوسری صدی ھجری کے شیعہ متکلمین کا کردار

۱۔ ابو ھاشم بن محمد بن علی علیہ السلام بن ابی طالب علیہ السلام المتوفی ۹۸ھ یا ۹۹ھ: اسلامی علم کلام کے سب سے پہلے مصنف ابو ھاشم بن محمد بن علی علیہ السلام بن ابی طالب علیہ السلام تھے کیونکہ آپ واصل بن عطا معتزلی کے استاد تھے اور ابو ھاشم کے بارے ت میں تمام اہل تشیع اور اہل تسنن کا اتفاق ہے کہ آپ اپنے دور میں علم کلام کے امام تھے۔ 39 یعنی ابو ھاشم اپنے دور میں علم کلام کے حوالے سے سب سے بڑی شخصیت تھے۔[40]

۲۔ اصبغ بن نباتہ المتوفی ۱۰۰ھ: حضرت اصبغ بن نباتہ حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ جنگ جمل و صفین میں آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ عظیم متکلم، عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم شاعر بھی تھے۔ آپ کی دو کتابیں بھی ذکر کی جاتی ہیں۔ 1: کتاب عجائب احکام امیر المومنین علیہ السلام۔ 2: کتاب قتل الحسین علیہ السلام۔[41]

۳۔ زید بن علی بن الحسین علیہ السلام المتوفی ۱۲۲ھ: آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ نے اپنے والد گرامی اور برادر معظم سے کئی علوم و معارف کو کسب فرمایا۔ آپ فقیہ، قاری اور خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ

مناظر اور متکلم بھی تھے۔آپ کے علم و عمل کی عظمت کے باعث فرقہ زیدیہ آپ کی امامت کا قائل ہے۔آپ نے کئی موضوعات پر کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن میں سے علم کلام پر تحریر کی جانے والی کتابیں درج ذیل ہیں:

1۔رسالۃتثبیت الامامۃ۔ 2۔رسالۃ تثبیت الوصیۃ۔ 3۔جواب علی واصل بن عطاء فی الامامۃ 4۔الرد علی المرجئۃ 5۔مناظرۃ اهل الشام6۔الرد علی المجبرۃ 7۔کتاب الصفوۃ 8۔المقالات علی المتعہ والامامہ۔[42]

۴۔الکمیت بن زید الاسدی المتوفی ۱۲۶ھ: ابن خنیس بن مجاہد الاسدی آپ کا مکمل نام تھا۔آپ بنی اسد کے خطیب، فقیہ، حافظ قرآن اور عظیم متکلم تھے لیکن آپ کی سب سے بڑی وجہ شہرت آپ کی لاجواب شاعری تھی۔آپ نے علم کلام پر باقاعدہ کوئی کتاب تو تحریر نہیں فرمائی البتہ آپ کے اشعار کا ایک بڑا حصہ علم کلام کے مسائل سے بھرا ہوا ہے۔مذہب شیعہ کے سب سے پہلے مناظر ہونے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔

جیسا کہ جاحظ کہتا ہے تشیع کے بارے میں مناظرہ کرنے والا سب سے پہلا شخص کمیت بن زید شاعر تھا اور اس نے مناظرہ میں ایسے دلائل پیش کیے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو لوگ حجت گزاری کی صورتوں سے آشنا نہ ہو پاتے۔[43]

۵۔جابر بن یزید الجعفی المتوفی ۱۲۸ھ: جابر بن یزید بن الحارث الجعفی دوسری صدی ہجری کے عظیم علمائے کرام میں سے تھے۔سید حسن صدر آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ آپ اصول الدین (علم کلام)، فقہ، تفسیر اور آثار اهل البیت علیہم السلام کے معتبر عالم شمار کیے جاتے تھے۔[44]

آپ نے کئی کتابیں تحریر فرمائیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

1۔التفسیر 2۔الفضائل 3۔ مقتل امیر المومنین علیہ السلام 4۔ مقتل الحسین علیہ السلام 5۔الصفین6۔النوادر۔[45]

۶۔زرارہ بن الاعین المتوفی ۱۳۰ھ تقریباً: آپ ابن سنسن الشیبانی اور ابوالحسن کی کنیت سے یاد کیے جاتے تھے۔آپ عظیم فقیہ اور علم کلام کے ماہر مانے جاتے تھے۔آپ نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے براہ راست کسب فیض فرمایا اور ایک دفعہ جب امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں ایک شامی سے مناظرہ کیا تو مناظرے میں کامیابی کے بعد امام علیہ السلام نے آپ سے فرمایا: یا حمران تجری الکلام علی الاثر فتصیب۔46 ترجمہ: اے حمران اثر (قرآن و حدیث) کی روشنی میں کلام کیا کرو، کامیاب رہو گے۔

۷۔ قیس الماصر المتوفی ۱۳۰: جناب قیس الماصر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے اصحاب باوفا میں سے تھے۔ آپ علم کلام میں بے پناہ مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حسن صدر رقمطراز ہیں کہ آپ ہشام بن حکم اور حمران الاحول سے بھی اچھے متکلم تھے۔ آپ نے علم کلام امام زین العابدین علیہ السلام سے حاصل کیا تھا۔[47]

جب ایک شامی امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب سے مناظرہ کرنے کے لیے آیا تو امام علیہ السلام نے اپنے مختلف شاگردوں کو جمع کیا لیکن مناظرہ جناب قیس الماصر نے کیا اور فتحیابی کے بعد امام علیہ السلام خوش ہوئے اور ان کو سراہتے ہوئے میدانِ مناظرے کا ماہر قرار دیا۔[48]

۸۔ عیسیٰ بن روضہ ۱۳۶ھ کے بعد کچھ عرصہ زندہ رہے: عیسیٰ بن روضہ ایک مشہور تابعی تھے۔ آپ بہت اچھے ماہر علم کلام تھے۔ آپ نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ آپ کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلامی علم کلام میں باقاعدہ طور سے تالیف و تصنیف کا آغاز کیا لیکن یہ دعویٰ قابل بحث ہے۔ جبکہ اپنے مقام پر اس دعویٰ کے حوالے سے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ واضح رہے کہ عیسیٰ بن روضہ منصور عباسی کے دور میں زندہ تھے اور منصور جب کسی مسئلے میں پریشان ہوتا تو عیسیٰ بن روضہ سے اس مسئلے کا حل دریافت کیا کرتا تھا۔ واضح رہے کہ منصور کو خلافت 136ھ کے بعد ملی تھی۔

۹۔ مؤمن الطاق المتوفی تقریباً ۱۶۰ھ: محمد بن علی بن نعمان بن ابی طریقۃ البجلی ابو جعفر کوفی دوسری صدی ہجری کے اواخر کے بڑے متکلمین میں سے ایک تھے۔ آپ کا لقب مؤمن طاق تھا۔ آپ کی علم کلام میں متعدد تصانیف ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔ 1۔ کتاب الامامۃ 2۔ کتاب المعرفۃ 3۔ کتاب الرد علی المعتزلۃ فی امامۃ المفضول 4۔ کتاب فی اثبات الوصیۃ 5۔ کتاب فی امر طلحۃ وزبیر وعائشۃ 6۔ کتاب فی المناظرات مع ابی حنیفۃ والمرجئۃ 5۔ کتاب فی الکلام مع الخوارج۔[49]

۱۰۔ خلیل بن احمد الفراہیدی المتوفی ۱۷۰ھ: خلیل بن احمد بن عمرو بن تمیم الفراہیدی دوسری ہجری کی نابغہ شخصیات میں سے ایک تھے۔ آپ نے پہلی عربی لغت لکھی جو کتاب العین کے نام سے مشہور ہے۔ آپ علم عروض کے بانی بھی تھے۔ اسکے علاوہ آپ نے لغت وادب میں جو کام کیا ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ علم کلام میں بھی بے پناہ مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔[50]

۱۱۔ مفضل بن عمر الجعفی المتوفی ۱۸۳ھ: جناب مفضل بن عمر علم کلام میں بے پناہ مہارت کے حامل تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور توحید مفضل ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے چند اور کتابیں بھی لکھیں:

1۔ کتاب الایمان والاسلام 2۔ کتاب فی بدء الخلق والحث علی الاعتبار وعلل الشرائع 3۔ وصیة المفضل 4۔ کتاب یوم ولیلة۔

۱۲۔ هشام بن سالم الجوالیقی المتوفی ۱۸۳ھ تقریباً: آپ دوسری صدی ہجری کے عظیم شیعہ متکلمین میں سے ایک تھے۔ کتب سیرت وتاریخ میں آپ کے کئی مناظرے ذکر کیے گئے ہیں۔ آپ کی تصنیفات درج ذیل ہیں: ۱۔ کتاب الامامة 2۔ کتاب نقض الامامة علی ابی علی۔[51]

۱۳۔ ہشام بن حکم المتوفی ۱۸۸ھ تقریباً: ابو محمد ہشام بن حکم نے دوسری صدی ہجری کے اواخر میں شیعہ علم کلام کے ارتقاء کے لیے بے مثال کردار ادا کیا۔ آپ بہت بڑے مناظر ہونے کے ساتھ علم کلام میں کئی کتب کے مصنف قرار پائے۔ آپ کی کتب مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ کتاب الامامة 2۔ کتاب المعرفة 3۔ کتاب الرد علی الزنادقه۔ 4۔ کتاب الرد علی اصحاب الاثنین۔ 5 کتاب التوحید 6۔ کتاب الاخبار 7۔ کتاب الرد علی اصحاب البطائع 8۔ کتاب الشیخ والغلام 9۔ کتاب التدبیر 10۔ کتاب المیزان 11۔ کتاب المیدان 13۔ کتاب الرد علی من قال بامامة المفضول۔ 13۔ کتاب اختلاف الناس فی الامامة 14۔ کتاب الوصیة والرد علی من انکرها 15۔ کتاب فی الجبر والقدر 17۔ کتاب الحکمین 18۔ کتاب الرد علی المعتزلة فی طلحة وزبیر 19۔ کتاب القدر وغیر ذالك۔[52]

۱۴۔ علی بن منصور المتوفی ۱۸۶ھ: ابو الحسن علی بن منصور کا تعلق کوفہ سے تھا۔ لیکن آپ نے بغداد کو محل سکونت قرار دیا۔ آپ ہشام بن الحکم کے اصحاب میں سے ایک بلند پایہ اور نمایاں ماہر علم کلام تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کتاب القدیر فی التوحید والامامة بھی ہے۔[53]

۱۵۔ فضل بن ابی سہل النوبختی المتوفی (بعد ۱۹۳ھ): آپ فارسی الاصل شیعہ متکلم تھے۔ آپ علم نجوم میں بھی بے پناہ مہارت کے حامل تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے چند علم کلام کے بارے میں بھی تھیں۔ آپ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف تھے:

1۔ کتاب النهمطان فی الموالید 2۔ کتاب الفال النجومی 3۔ کتاب الموالید 3۔ کتاب تحویل سنی الموالید 4۔ کتاب المدخل 5۔ کتاب التشبیه والتمثیل 6۔ کتاب المنتحل من اقاویل المنجمین فی الاخبار والمسائل ولموالید۔[54]

۱۶۔ جابر بن حیان المتوفی ۲۰۰ھ: جابر بن حیان دوسری صدی ہجری کے آخری عظیم شیعہ متکلم تھے۔ آپ کئی علمی میدانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ جن میں علم کیمیاء، فلسفہ و کلام قابل ذکر ہیں۔ آپ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں 300 کتابیں فلسفہ کے بارے میں ہیں اور 500 کتابیں فلاسفہ پر نقد کے بارے میں ہیں ۔ آپ نے جو کتابیں علم کیمیاء اور علم کلام کے بارے لکھی ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔[55] آپ کی طرف سے فلسفہ و کلام اور منطق کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں سے چند یہ ہیں:

1۔ کتاب الامامۃ 2۔ القدیم 3۔ الحکمۃ المصونۃ 4۔ العدل 5۔ اللاھوت 6۔ صندوق الحکمۃ 7۔ کتاب الھی 8۔ صفۃ الکون 9۔ کتاب الجارون 10۔ مصطلحات ارسطاطلیس

تیسری صدی ہجری کے شیعہ متکلمین کا علم کلام کے ارتقاء میں کردار

تیسری صدی ہجری کے وہ شیعہ متکلمین جنہوں نے علم کلام کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے کتابوں کی علمی میراث چھوڑی ہے، ان کی فہرست کافی طولانی ہے۔ ہم یہاں صرف ان علماء کا تذکرہ کریں گے جنہوں نے علم کلام میں نسبتاً زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔

۱۔ یونس بن عبدالرحمان المتوفی ۲۰۸ھ: یونس بن عبدالرحمان، علی بن یقطین کے غلام اور اپنے دور کے جلیل القدر متکلم تھے۔ آپ نے تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے اہم ترین کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

1۔ کتاب السھو 2۔ کتاب الادب والدلالۃ علی الخیر۔ 3۔ کتاب الزکاۃ 4۔ کتاب جوامع الآثار 5۔ کتاب البداء 6۔ کتاب الرد علی الغلاۃ 7۔ کتاب المتعۃ 8۔ کتاب الامامۃ۔[56]

۲۔ ابن ابی عمیر المتوفی ۲۱۷ ھ: محمد بن ابی عمیر، ابو احمد بغدادی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور امام علی رضا علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے اور ان سے احادیث سنیں۔ ابن ابی عمیر اپنے دور کے جلیل القدر متکلمین میں سے ایک تھے۔ آپ نے علم کلام میں کئی کتابیں تحریر فرمائیں۔ تاہم درج ذیل میں صرف اہم کتب کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

1۔ کتاب البداء 2۔ کتاب الاحتجاج فی الامامۃ 3۔ کتاب المتعۃ 4۔ کتاب الاستطاعۃ 5۔ کتاب التوحید 6۔ کتاب المعارف 7۔ کتاب یوم ولیلۃ 8۔ کتاب اختلاف الحدیث۔[57]

۳۔ الحسن ابن علی بن ابی حمزہ البطائنی المتوفی ۲۲۴ھ: آپ ابو محمد کی کنیت اور الکوفی کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ علوم رجال، فقہ، حدیث و تفسیر کے ماہر شمار کیے جاتے تھے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتب درج ذیل ہیں:

1۔کتاب الدلائل 2۔کتاب الرجعة 3۔کتاب الغیبه 4۔کتاب فضائل القرآن5۔کتاب فضائل امیرالمؤمنین 6۔کتاب المتعة7۔کتاب الفرائض8۔کتاب الصلاة9۔کتاب الفتن۔

چونکہ آپ نے علم کلام کے موضوعات پر قلم اٹھایا اس لیے آپ تیسری صدی کے شیعہ متکلمین میں شمار ہوتے ہیں۔[58]

۴۔ابوالحسین الراوندی المتوفی ۲۴۵ھ: آپ احمد بن یحیی بن محمد بن اسحاق ابو الحسین الراوندی بغداد کے رہنے والے تھے۔ابتداء میں آپ کا تعلق فرقہ معتزلہ سے تھااور آپ ایک متکلم کے طور پر جانے جاتے تھے۔بعد میں آپ نے مذہب شیعہ امامیہ قبول کیا۔مسعودی کے مطابق آپ نے 114 کتابیں لکھیں جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

1۔کتاب التوحید 2۔کتاب المعرفة 3۔کتاب اثبات الرسل 4۔کتاب الامامة 5۔کتاب خلق القرآن6۔کتاب الابتداء والاعادة 7۔کتاب البقاء والفناء 8۔کتاب العروس 9۔کتاب الرد علی الزنادقة 10۔کتاب فی اجتها د الرائ۔59

۵۔محمد بن ھارون ابو عیسیٰ الوراق المتوفی ۲۴۷ھ: آپ ابو عیسیٰ الوراق البغدادی کے نام سے بھی مشہور تھے۔آپ ایک متکلم ،مناظر اور مذاہب وفرق وامم کے بارے وسیع معلومات کے حامل تھے۔ابوالعباس النجاشی نے آپ کو شیعہ متکلمین میں سے ایک قرار دیاہے۔آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔جن میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

1۔کتاب الامامه الکبیر 2۔کتاب اختلاف الشیعه 3۔کتاب اختلاف الشیعه و المقالات 4۔کتاب المجالس 5۔کتاب السقیفه6۔کتاب الرد علی النصاری الکبیر8۔کتاب الرد علی الیهود9۔کتاب الرد علی المجوس۔[60]

۶۔فضل بن شاذان الازدی المتوفی ۲۶۰ھ: آپ ابن الازدی ابو محمد النیسابوری کے نام سے مشہور تھے۔آپ اپنے زمانے کے مشہور شیعہ امامیہ متکلمین میں سے ایک تھے۔جناب کلینی، صدوق، النجاشی والطوسی نے آپ کے اقوال کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔جن میں سے چند ایک کے نام پیش خدمت ہیں:

1۔ الرد علی الغلاة 2۔ الرد علی القرامطة3۔ الرد علی الحشویة 4۔ الرد علی الثنویة 5۔ الرد علی الفلاسفة۔[61]

۷۔علی بن مھزیار المتوفی قبل از ۲۵۴ھ: آپ ابوالحسن الاھوازی کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔آپ جلیل القدر عالم اور ائمہ علیہم السلام کے وکلاء میں سے ایک تھے۔آپ کی ملاقات حضرت امام رضا علیہ السلام سے ہوئی اور امام جواد علیہ السلام اور امام ھادی علیہ السلام کی بارگاہ میں حضوری سے مشرف ہوئے۔آپ نے امام جواد علیہ السلام اور امام ھادی علیہ السلام کی وکالت کرنے کا شرف بھی حاصل کیا۔آپ نے کئی علوم میں کتب تحریر کیں۔ان میں سے اہم درج ذیل ہیں:

1۔ کتاب الرد علی الغلاۃ 2۔ کتاب القائم 3۔ کتاب التقیہ 4۔ کتاب الانبیاء 5۔ کتاب البشارات 6۔ کتاب التفسیر 7۔ کتاب الصلوٰۃ 8۔ کتاب الزکاۃ 9۔ کتاب المکاسب 10۔ کتاب النوادر۔[62]

۸۔ احمد بن داؤود ابو یحیی الجرجانی المتوفی ۲۵۴ھ: آپ احمد بن داؤود بن ابو یحیی الجرجانی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ آپ کا شمار اہل سنت علماء میں ہوتا تھا لیکن بعد میں آپ نے شیعہ امامیہ کا مذہب اختیار کر لیا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے اہم درج ذیل ہیں:

1۔ کتاب التفویض 2۔ الرد علی الحنبلی 3۔ الرد علی السجزی 4۔ المتعۃ 5۔ الرجعۃ 6۔ المسح علی الخفین 7۔ طلاق المتعہ 8۔ طلاق المجنون 9۔ نکاح السکران۔[63]

۹۔ معلی بن محمد البصری المتوفی ۲۶۰ھ: البصری آپ کا لقب تھا اور ابو الحسن کی کنیت سے مشہور تھے۔ آپ شیخ کلینی کے استاد ابو عبداللہ الحسین بن محمد بن عامر الاشعری کے استاد تھے۔ آپ کے شاگرد نے آپ سے کئی روایات نقل کی ہیں۔ آپ کی کتب میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ کتاب الدلائل 2۔ کتاب الامامہ 3۔ کتاب الایمان و درجاتہ وزیادتہ ونقصانہ 4۔ کتاب الکفر و وجوھہ 5۔ کتاب سیرۃ القائم علیہ السلام 6۔ کتاب التفسیر 7۔ کتاب فضائل امیرا لمؤمنین علیہ السلام 8۔ کتاب قضایا امیرالمؤمنین 9۔ کتاب المروۃ 10۔ کتاب شرح المودۃ فی الدین۔[64]

۱۰۔ علی بن حسین بن علی بن فضال المتوفی ۲۷۰ھ: آپ ابن عمرو التیمی ابو الحسن الکوفی کے نام سے معروف تھے۔ آپ کا شمار اپنے دور کی اہم علمی شخصیات میں ہوتا تھا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے اہم یہ ہیں:

1۔ کتاب الدلائل 2۔ کتاب المعرفۃ 3۔ کتاب اثبات الامامۃ عند اللہ 4۔ کتاب الغیبہ 5۔ کتاب البشارات 6۔ کتاب الجنہ والنار 7۔ کتاب الانبیاء 8۔ کتاب التفسیر 9۔ کتاب الرجال 10۔ کتاب العلل 11۔ کتاب الصلوٰۃ 12۔ کتاب الزکاۃ 13۔ کتاب المواعظ۔[65]

۱۱۔ ابراہیم بن محمد السعید الثقفی المتوفی ۲۸۳ھ: آپ ابو اسحاق کوفی اور پھر اصفہانی کے لقب سے مشہور تھے آپ فقیہ، متکلم اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مصنف تھے آپکی چند اہم کتب درج ذیل ہیں

1۔ کتاب المبتداء (فی العقائد) 2۔ کتاب المعرفۃ 3۔ کتاب فی الامامۃ 4۔ کتاب فی الامامۃ الصغیر 5۔ کتاب الدلائل 6۔ کتاب الحجۃ فی فضل المکرمین 7۔ کتاب السقیفۃ۔[66]

۱۲۔ سعد بن عبداللہ بن ابی خلف الاشعری المتوفی، ۳۰۰ھ: آپ کو ابوالقاسم القمی کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ آپ علم کلام اور فرق اسلامیہ سے متعلقہ موضوعات کے ساتھ ساتھ علم الفقہ اور علم حدیث میں بھی ماہر تھے۔ آپ کی اہم کتب یہ ہیں:

1۔ کتاب الامامة 2۔ کتاب ناسخ القرآن و منسوخه و محکمه و متشابهه 3۔ کتاب الرد علی الغلاة 4۔ کتاب الرد علی المجبرة 5۔ کتاب فرق الشیعة 6۔ کتاب الاستطاعة 7۔ کتاب المنتخبات 8۔ کتاب الرحمة ۔[67]

خلاصہ

اس مقالے کو تحریر کرنے کا بنیادی مقصد علم کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے شیعہ علم کلام کے تاریخی ارتقاء کا ایک جائزہ پیش کرنا ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں بیانی اور تجزیاتی طرز تحقیق استعمال کیا گیا ہے۔ اسلامی علم کلام کو بنیادی طور سے دو مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے: پہلا مرحلہ اسلامی علم کلام کا لسانی دور ہے جب کہ دوسرا مرحلہ اسلامی علم کلام کا تحریری اور کتابی دور ہے۔ پہلے مرحلے میں اسلامی علم کلام کے بانی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

اگر تحریری اور کتابی شکل میں اسلامی علم کلام کے بانی کی بات کی جائے تو اس بارے میں تین آراء ذکر کی جاتی ہیں: (۱) ابو حذیفہ واصل بن عطا معتزلی (۲) عیسیٰ بن روضہ (۳) علی بن اسماعیل میثمی۔ لیکن اس مقالے میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان مذکورہ بالا شخصیات میں سے کوئی بھی اسلامی علم کے تحریری مرحلے کا بانی نہیں تھا بلکہ اس شخصیت کا نام جنہوں نے اسلامی علم کلام پر سب سے پہلی کتاب لکھی وہ ابوھاشم بن محمد بن علی علیہ السلام بن ابیطالبؑ ہیں اس مقالے میں مختلف ادوار میں اسلامی علم کلام کے موضوعاتی اور منہجی پس منظر کو بھی مورد بحث قرار دیا گیا ہے نیز اس مقالے میں تیسری صدی هجری تک اہم شیعہ متکلمین کا سلسلہ وار ذکر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ راغب الاصفہانی، الحسین بن محمد، المطبعة المیمنیة، 1906ھ، مفردات الراغب فی غریب القرآن باب کلم۔

2۔ الفارابی، ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان انصاری، احصاء العلوم، مرکز الانماء القومی، بیروت لبنان، ص، ۴۱۔

3۔ ابن خلدون، عبدالرحمان، مقدمہ ابن خلدون، منشورات علمی و فرہنگی، طہران، ص ۴۵۸۔

4۔ الایجی، عضد الدین عبدالرحمان بن احمد، شرح المواقف، منشورات الشریف الرضی، قم ۱۳۷۰ش، ج، ۱، ص، ۳۳۳۔

5۔ التفتازانی، سعدالدین مسعود بن عمر بن عبداللہ، شرح المقاصد فی علم الکلام، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۱، ص ۴۳۷۔

6۔الطبرسی، ابو منصور احمد بن علی بن ابی طالب، الاحتجاج، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت لبنان، 61 ۱۴ھ ۲۰۰۰م، ج۱، ص۲۸
7۔ حوالہ سابق، ص۲۰۵۔
8۔السیوطی، جلال الدین عبد الرحمان بن ابی بکر م ۹۱۱ھ، الوسائل فی مسامرۃ الاوئل، بیروت لبنان دار الکتب العلمیہ ۱۹۸۶م، ط۱، ص۱۱۶، الرقم ۸۵۷۔
9۔الطوسی، ابو جعفر محمد بن الحسن م ۴۶۰ھ، الفہرست، مؤسسۃ نشر الفقاھۃ، ۱۴۲۲ھ، ط۲، ص۱۵۰، الرقم ۳۷۴۔
10۔ابن ندیم، محمد بن اسحاق الندیم، الفہرست فی أخبار العلماء المصنفین من القدماء والمحدثین و أسماء کتبہم، مطبعۃ رحمانیۃ مصر، ۱۳۴۸ھ، ص۲۴۹۔
11۔العاملی، سید حسن صدر، تاسیس الشیعۃ الکرام لعلوم الاسلام، مؤسسۃ تراث الشیعۃ ۱۳۹۵ھ ش، ط۱، ج۲، ص۹۴۲۔
12۔الامین، السید محسن، اعیان الشیعۃ، دار المعارف للمطبوعات، ۲۰۰۰م، ط۵، ج۳، ص۴۳، الرقم ۸۶۶۱۔
13۔النجاشی، ابو العباس احمد بن علی بن احمد الاسدی الکوفی (م450ء)، رجال النجاشی، مؤسسۃ النشر الاسلامی، 1416ھ، قم، ط5، ص۲۹۴، الرقم ۷۹۶۔
14۔ سبحانی، جعفر، معجم المتکلمین، مؤسسۃ الامام الصادقؑ، 1424ھ، ط1، ج۱، ص۴۰۰۔
15۔عاملی، السید حسن صدر، تاسیس الشیعہ، ج۲، ص۹۴۷۔
16۔ نفس المصدر، ج۲، ص۹۴۷۔
17۔الذھبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد عثمان، (م748)، سیر اعلام النبلا، بیروت لبنان، مئوسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳م، ط۹، ج۴، ص۱۲۹۔
18۔الدینوری، ابو محمد عبد اللہ بن مسلم ابن قتیبہ، م ۲۱۳ھ۔المعارف، اخبار علی ابن ابیطالب، دار المعارف، ۱۹۶۹م، مصر، ط۲، ص۲۱۷۔
19۔ الشہرستاني، محمد بن عبد الکریم، ملل والنحل/دار المعرفہ لبنان، جلد1، ص24۔
20۔ تطور علم الکلام الاسلامی، علی المدن، ص137، مرکز دراسات فلسفۃ الدین، بغداد ط۔1۔ج10۔
21۔الکلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، طہران، دار الکتب الاسلامیۃ ش 1363، ط5، ج1، ص171۔
22۔ تطور علم الکلام الاسلامی، علی المدن، ص142 ۔ 155۔
23۔المازندرانی، منتھی المقال فی احوال الرجال، ابو علي محمد بن اسماعیل الحائری متوفی 1216ھ، مؤسسہ اہل البیتؑ، قم، 1416.ط1ج3 ص166۔
24۔ابن الأثیر الجزري، عزالدین أبي الحسن، الکامل فی التاریخ، ۵۱۴:۲، بیروت، 1966۔
25۔ نفس المصدر، ج2ص163۔

26۔ ابن الأثیر الجزري، عزالدین أبي الحسن، الکامل فی التاریخ، ۵۱۴:۲، بیروت، ط ۱۹۸۷، ج3، ص71۔
27۔ الیعقوبی، أحمد الیعقوبي، تاریخ الیعقوبی، بیروت، دار صادر، ج2، ص171۔
28۔ نفس المصدر، ج۳، ص۲۱۶۔
29۔ الیعقوبی، أحمد الیعقوبي، تاریخ الیعقوبی، بیروت، ج2، ص 179۔
30۔ ابن سعد، محمد بن سعد بن منیع، طبقات کبیر لابن سعد، ج6 ص 217۔
31۔ النساء۔135۔
32۔ الیعقوبی، أحمد الیعقوبي، تاریخ الیعقوبی، بیروت، ج2، ص179۔
33۔ نفس المصدر ج2، ص2720۔
34۔ ج1، ص277، معجم طبقات المتکلمین اہل قلم کی ایک جماعت تحت اشراف جعفر سبحانی۔
35۔ ابن الأثیر الجزري، عزالدین أبي الحسن، الکامل فی التاریخ، ۵۱۴:۲، بیروت، 28/3۔
36۔ السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلمین ج1، ص268۔
37۔ العاملی، السید حسن صدر، تاسیس الشیعۃ الکرام لعلوم الاسلام، ج2، ص962۔
38۔ السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلمین ج1، ص268۔
39۔ نفس المصدر، ج۲، ص۹۴۷۔
40۔ الذهبی، ابو عبد الله محمد بن احمد عثمان، (م748)، سیر اعلام النبلا، بیروت لبنان، مئوسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳م، ط۹، ج۴، ص۱۲۹۔
41۔ نفس المصدر، معجم طبقات المتکلمین، ج1، ص286۔
42۔ خیر الدین الزرکلی، اعلام المؤلفین الزیدیۃ، ط 1980، م5۔
43۔ عبد الحمید ابن ابی الحدید (م656ھ)، (شرح العقائد العلویات السبع) الروضۃ المختارۃ، بیروت مؤسسۃ الاعلمی، ص160۔
44۔ العاملی، السید حسن صدر، تاسیس الشیعۃ، ج2۔
45۔ السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلین، ج1، ص297۔
46۔ الکلینی، محمد بن یعقوب الرازی (م329ھ)، الکافی ص171۔
47۔ العاملی، السید حسن صدر، تاسیس الشیعہ، ج2، ص972۔
48۔ الکلینی، محمد بن یعقوب الرازی (م329)، الکافی، ج1، ص171۔
49۔ السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلمین ج1، ص339۔

50۔ نفس المصدر ج1، ص299۔

51۔ابن ندیم، محمد بن اسحاق الندیم، الفہرست فی أخبار العلماء المصنفین من القدماء والمحدثین و أسماء کتبھم، مطبعۃ رحمانیۃ مصر1348ھ۔

52۔ نفس المصدر، ص ۲۵۰۔

53۔النجاشی، ابوالعباس احمد بن علی النجاشی (متوفی450)، رجال النجاشی، مؤسسۃ النشرۃ الاسلامی التابعۃ لجماعۃ المدرسین قم المقد سۃ1407ھ، ص250 رقم658۔

54۔ابن ندیم، محمد بن اسحاق الندیم، الفہرست لابن ندیم، ص438۔

55۔السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلمین، ج 1ص289۔

56۔النجاشی، ابوالعباس احمد بن علی النجاشی متوفی450، رجال نجاشی ص448 رقم1209 مؤسسۃ النشر الاسلامی1424ھ۔

57۔ نفس المصدر، ص362۔

58۔ابن داود الحلي، أبو محمد الحسن بن علي، الملقب بتقي الدين، رجال ابن داؤود، منشورات الرضی النجف، 1972م، ص، 440، رقم، 121۔

59۔السبحانی، العلامۃ جعفر، معجم طبقات المتکلمین، ج، 1ص، 364۔

60۔النجاشی، ابوالعباس احمد بن علی النجاشی (متوفی450)، رجال النجاشی، ج، 2، ص، 280، رقم، 1017۔

61۔الکشی، ابو عمر، الرجال الکشی ص451، رقم، 416، مؤسسۃ الاعلمی کربلاء۔

62۔رجال الرضی، ص، 54۔

63۔النجاشی، ابوالعباس احمد بن علی النجاشی (متوفی450)، رجال النجاشی، ج2، ص436، رقم1232۔

64۔آقا بزرگ الطہرانی، الشیخ محمد محسن (م1389ء)، الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ، بیروت، دار الاصفر، 982ھ، ط2، ج، 2، ص، 338۔

65۔الطوسی، ابو جعفر محمد بن الحسن، م ۴۶۰ھ، فہرست الطوسی ص، 118، رقم، 393۔

66۔ نفس المصدر، ص، 118، رقم، 393۔

67۔الحلی، العلامۃ الحلي أبي منصور الحسن بن یوسف بن المطهر الأسدي، خلاصۃ الأقوال فی معرفۃ الرجال، قم، مؤسسۃ النشر الاسلامی، ط1417، 1ھ، ص78، رقم3۔

اہل تشیع کے ہاں علم تفسیر کے تاریخی ارتقاء کا ایک جائزہ(1)

Historical Evolution of Shi'ite Exegesis of Holy Quran

ارشاد حسین یزدانی
(فاضل جامعۃ الکوثر و متعلم حوزہ علمیہ نجف اشرف)

Abstract

The Quran is a book of guidance and complete code of conduct. In view of its miraculous aspect, the holy Quran requires exegesis which itself has developed into a distinctive science. Therefore, it is significant to gain knowledge about the science of exegesis, its subject, objectives, and chronological development. Often exegetists and researchers classify the fourteen hundred years history of exegesis of holy Quran into several phases in which this science developed. The purpose of this research paper is not merely the description of those historical phases but it is essential to explain the style and methods of exegesis along with the exegetists of Quran throughout all these phases. In this way, we will be able to elaborate the all dimensions of chronological aspects of exegesis. This paper will further explore the scope of research for scholars and students of science of exegesis.

Keywords: Historical, Evalution, Shiit Exegesis, Holy Q, uran,

مقدمہ

کسی بھی علم کو سمجھنے کے لیے اس علم کا تعارف، موضوع، غرض وغایت، اہمیت اور افادیت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح اس علم کی تاریخ سے آگاہی بھی بہت ضروری ہے کہ وہ علم کتنا قدیم ہے، اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے، اور یہ کہ وہ تاریخ کے کن کن مراحل سے گزرا ہے۔

قرآن کتاب ہدایت، مکمل ضابطہ حیات اور انسانی زندگی کے لیے کامل دستور زندگی ہے۔ قرآن اپنے اس معجزاتی پہلو کے پیش نظر تفسیر کا محتاج ہے تاکہ اس قرآن میں بیان کردہ آفاقی مطالب اور تعلیمات کو سمجھ کر انسان اپنی زندگی کے لیے رہنمائی حاصل کر سکے۔ لہذا تفسیر قرآن ایک مکمل علم کی حیثیت رکھتی ہے اور علوم قرآن میں یہ ایک علم شمار ہوتا ہے۔ اس لیے علم

تفسیر کا تعارف،اسکا موضوع، غرض وغایت اوراسکی تاریخی حیثیت جاننا باقی علوم کی نسبت کہیں زیادہ ضروری اور اہم ہے۔بہت سے مفسرین اور محققین نے اپنی تحقیقات میں تفسیرِ قرآن کی چودہ سو سالہ تاریخ کو مختلف ادوار کی شکل میں پیش کیا ہے۔اور علم تفسیر کے ان تاریخی مراحل کاذکر کیاہے جن مراحل سے علم تفسیر کا گزر ہواہے۔لیکن ہماری کوشش ہے کہ ہم علم تفسیر کے ان تاریخی ادوار کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس نکتے کو بھی ذکر کریں کہ ہر دور میں تفسیر قرآن کا منہج ,طریقہ کار کیارہاہے اور ہر دور کے مفسرین کاذکر بھی کریں تاکہ علم تفسیر کی تاریخی حیثیت اپنی تمام ترجہات سے روشن اور عیاں ہو سکے۔

تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ اور مفہوم

تفسیر کا لغوی معنیٰ: تفسیر فَسَرَ سے ہے اور فَسَرَ کا معنیٰ أبان و کَشَفَ ہے۔اس کا مطلب ہے کسی شئ کو ظاہر کرنا،کھولنااور پردہ اٹھانا۔

راغب نے فسر اور سفر کو قریب المعنی قرار دیاہے۔یعنی دونوں کا مفہوم اور معنیٰ ایک دوسرے کے قریب قریب ہے۔اوران دونوں کے معنیٰ میں فرق یہ ہے کہ معنیٰ معقول کو کشف اور بیان کرنا ہو تو لفظ تفسیر استعمال ہوتاہے اور اگرکسی شئ خارجی کو کشف اور اظہار کرنا ہو تو لفظ،سفر استعمال ہوتاہے۔ مثال اسفرت المرأۃ عن وجھھا۔عورت بے نقاب ہوئی۔اسی طرح اسفر الصبح یعنی صبح ظاہر ہوگئی۔ [1]

وقال اللہ تبارك وتعالیٰ: وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۔[2] اور یہ لوگ جب بھی آپ کے پاس کوئی مثال لے کر آئیں تو ہم جواب میں آپ کو حق کی بات اور بہترین وضاحت سے نوازتے ہیں۔اس آیت میں احسن تفسیراً کا معنیٰ ہے بیان کرنااور کشف کرنا۔

تفسیر کا اصطلاحی معنیٰ اور مفہوم: تفسیر کا اصطلاحی معنیٰ مشکل لفظ میں موجود ابہام کو دور کرنا یعنی وہ لفظ جس کا معنیٰ مقصود سمجھنے میں مشکل ہو اس سے ابہام دور کرکے مقصود معنیٰ واضح کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔[3]

پس کلام کی تفسیر سے مراد ہے اس کے معنیٰ کو ظاہر کرنااوراس معنیٰ کو بیان کرنا جس معنیٰ کی طرف لفظ اشارہ کر رہاہے۔

علمِ تفسیرِ قرآن

مندرجہ بالا تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی معنی صرف لفظ تفسیر کے اعتبار سے ہے، لیکن جب ہم علم تفسیر کہتے ہیں تو اس سے مراد تفسیر قرآن ہوتی ہے۔ لفظ تفسیر اور علم تفسیر میں فرق یہ ہے کہ تفسیر کسی بھی کلام کے لغوی اور اصطلاحی معنی کو کہتے ہیں لیکن علم تفسیر سے صرف اللہ کا کلام یعنی قرآن مجید کی تفسیر مراد ہوتی ہے۔ اب جب کہ لفظ تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان ہو گیا ہے تو ہمیں معلوم کرنا ہو گا کہ علم تفسیر کا معنی اور مفہوم کیا ہے۔

علم التفسیر کے معنٰی اور مفہوم

ابو حیان نے علم تفسیر کو اس طرح بیان کیا ہے:

علم تفسیر وہ علم ہے جس میں مندرجہ ذیل چیزوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ الفاظِ قرآن کے تلفظ کی کیفیت کو بیان کرنا، الفاظ قرآن کے کلی اور جزی کو بیان کرنا اور اس معنی کو بیان کرنا جس معنی کی طرف لفظ اشارہ کر رہا ہے۔-[4]

دوسری تعریف: قرآن کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک مستقل علم کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً قرآن کا یہ پہلو کہ وہ پڑھی جانے والی کتاب ہے اس جہت سے یہ علم قرأت کا موضوع ہے۔ قرآن کا یہ پہلو کہ اس کا تلفظ کیسے کیا جائے یہ علم تجوید کا موضوع ہے۔

ان دو مثالوں کے پیش نظر علم تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ قرآن کو جب کلام الٰہی ہونے کی جہت سے دیکھتے ہیں اور بحث کرتے ہیں تو اس کو علم تفسیر کہتے ہیں۔-[4]

تفسیر اور ترجمہ میں فرق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر اور ترجمہ میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کے جواب میں علماء نے لکھا ہے کہ ترجمہ صرف لفظ کے لغوی معنی کو کہتے ہیں جبکہ تفسیر میں کلام کے لغوی معنی کے ساتھ اس معنی میں موجود ابہام کو دور کر کے مطلوبہ معنی کو بیان کیا جاتا ہے۔-[5]

تفسیر اور تأویل میں فرق

تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کرنے کیلئے سب سے پہلے تاویل کا اصطلاحی معنی جاننا ضروری ہے۔

تاویل کے اصطلاحی معنی متقدمین اور متأخرین کے درمیان مختلف ہیں۔ متقدمین کے نزدیک تأویل کا وہی معنٰی ہے جو تفسیر کا ہے۔اس لیے متقدمین کے نزدیک کلمہ تفسیر اور تاویل مترادف ہیں۔یعنی ان دونوں کا معنٰی ایک ہے۔ جبکہ متأخرین کے نزدیک تأویل کا معنی تفسیر سے مختلف ہے۔اس لیے اس معنٰی کی بناء پر تأویل اور تفسیر میں فرق ہو سکتا ہے تفسیر اور تاویل کے معنی کو دیکھا جائے توان دونوں میں فرق موردی ہے۔دونوں کا مورد اور مقام الگ ہے۔ تفسیر کا مورد ابہام المعنی ہے اور تأویل کا مورد اور مقام حصول الشبہ ہے۔ باالفاظ دیگر تفسیر میں مشکل لفظ کے ابہام کو دور کیا جاتا ہے اور تاویل میں قول یا فعل میں موجود شبہ کو دور کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اور فرق بھی بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً:تاویل تفسیر سے اخص ہے۔وغیرہ۔[6]

لفظ اور معنی کے اعتبار سے تفسیر کی تقسیم

جس شے کی تفسیر کی جارہی ہے وہ یا لفظ ہو گا یا معنٰی ہو گا۔یعنی کبھی لفظ مبہم ہو تو اس کی تفسیر کی جاتی ہے اور کبھی معنٰی مبہم ہو تو اس کی تفسیر کی جاتی ہے۔اس اعتبار سے تفسیر کی دو قسمیں ہیں:

1: لفظ کی تفسیر　　　　2 : معنی کی تفسیر

لفظ کی تفسیر: تفسیر اللفظ هو عبارة عن بیان معناه لغة۔لفظ کی تفسیر سے مراد اس لفظ کے لغوی معنٰی بیان کرنا ہے۔

معنٰی کی تفسیر: تفسیر المعنی عبارة عن تحدید مصداقه الخارجی الذی ینطبق علیه معنی اللفظ۔ معنی کی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ لغوی معنی کے مصداق خارجی کو بیان کرنا جس پر لفظ کا لغوی معنی منطبق ہو رہا ہے۔[7]

اس طرح تفسیر کے دو مرحلے ہوں گے۔ پہلے مرحلے میں لفظ کے لغوی معنی کو بیان کرنا اور دوسرے مرحلے میں اس لغوی معنی کا مصداق خارجی معین کرنا۔

شواہد قرآن

قرآن مجید میں اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں لیکن ہم ایک ہی مثال پر اکتفا کریں گے۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے حیاۃ، علم، قدرۃ، السمیع، البصیر، متکلم وغیرہ ان کلمات کی تفسیر ہم دو مرحلوں میں کرتے ہیں: پہلا مرحلہ یہ کہ ان الفاظ کے معانی لغویہ کیاہیں اور دوسرے مرحلے میں ہم بحث کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ الفاظ کون سے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔اس طرح پہلا مرحلہ تفسیر لفظی کہلاتاہے اور دوسرے مرحلے کو تفسیر معنوی کہتے ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتاہے: وَهَذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ۔[8]

اور یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے یہ بابرکت ہے اور اپنے سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ"۔[9]اور ہم نے لوہے کو بھی نازل کیا ہے جس میں شدید جنگ کا سامان ہے۔وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ۔[10]ہم نے آسمان سے ایک خاص مقدار میں پانی برسایااور پھر اسے ہم نے زمین میں بسادیا۔

ان تینوں آیات مجیدہ میں ہم ملاحظہ کررہے ہیں کہ یہ آیات کچھ چیزیں بیان کررہی ہیں جنہیں نازل کیا گیاہے۔ مثلاً کتاب، حدید اور ماءاور ان آیات کی تفسیر میں ہم سب سے پہلے نزول کے لغوی معنی دیکھیں گے کہ نزول کا معنی لغوی(الھبوط من جھۃ عالیہ)یعنی کسی چیز کااوپر سے نیچے آنا۔اس کے بعد ہم تفسیر معنوی میں معین کریں گے کہ یہاں پر نزول مادی مراد ہے یانزول معنوی۔یعنی کتاب، حدید اور ماءاپنی مادی جسم کے ساتھ نازل ہوئے ہیں یامراد یہاں نزول معنوی ہے۔اسے تفسیر معنوی کہتے ہیں۔[11]

خلاصہ کلام یہ کہ ایک مرتبہ تفسیر لفظ کی ہوتی ہے اور ایک مرتبہ معنی کی۔اسطرح تفسیر کی دو قسمیں بنتی ہیں: تفسیر لفظی اور تفسیر معنوی۔

تفسیر قرآن کی ضرورت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ قرآن کریم کیوں تفسیر کا محتاج ہے؟ جبکہ قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں جو بیان کر رہی ہیں کہ قرآن واضح کتاب ہے۔ قرآن ہر شے بیان کرنے آیا ہے۔ اور اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے۔

ان میں سے چند آیات پیش کرتے ہیں:

قال اللہ تبارک و تعالیٰ: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ ہم نے اس کتاب کو آپ پر نازل کیا ہے ہر شے کے بیان کے لیے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا۔ ہم نے آپ کی طرف ایک واضح نور نازل کیا۔ وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہاری طرف ایک تفصیلی کتاب نازل کی۔

اس کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ قرآن تفصیل بیان کرنے والا ہے۔ قرآن واضح کتاب ہے۔ قرآن واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس کے باوجود قرآن تفسیر کا محتاج ہے کیوں؟ آخر قرآن کی تفسیر کی ضرورت ہے۔ کیوں؟

پانچ اسباب کی وجہ سے قرآن تفسیر کا محتاج ہے

علماء کے کلمات سے اگر تلاش کیا جائے تو بہت سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے قرآن تفسیر کا محتاج ہے۔ ان میں سے پانچ اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا سبب: قرآن میں اجمال کا پایا جانا

قرآن مجید میں بہت سے احکام ہیں جو مجمل ہیں اور تفصیل کے محتاج ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: واقیموالصلاۃ و آتوالزکوٰۃ۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

نماز اور زکوٰۃ کا حکم مجمل ہے۔ اس کی کیفیت بیان نہیں ہوئی، نماز کیسے ادا کرنی ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کی کیفیت کیا ہے؟ یہ چیزیں تفصیل اور بیان کی محتاج ہیں۔

اس لیے ارشاد قدرت ہوتا ہے: وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ اور ہم نے آپ پر ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو بتائیں کہ ان کی طرف کیا نازل ہوا ہے اور شاید وہ غور و فکر سے کام لیں۔

اسی طرح امام صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا تو تین یا چار آیات مکمل نہیں ہوتی تھیں مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان آیات کی تشریح اور تفسیر بیان کر دیتے تھے۔

دوسرا سبب: قرآن کے دقیق معانی پر مشتمل ہونا

قرآن مجید بعض ایسے مفاہیم اور معانی پر مشتمل ہیں جن میں موجود دقت اور رقت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن کی تفسیر ضروری ہے تاکہ ان مفاہیم دقیقہ اور معانی رقیقہ کو آسان کر کے بیان کیا جاسکے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہی مطالب اور مفاہیم کی وضاحت کے لیے بھیجا گیا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ اللہ وہ ذات ہے کہ جس نے انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ قرآن تفسیر کا تقاضا کرتا ہے ورنہ معلّم کی ضرورت نہ ہوتی۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے معلّم قرآن ہیں۔ ان معانی اور مفاہیم دقیقہ میں سے اسرار خلقت و اسرار وجود الٰہی (صفات جمالیہ، صفات کمالیہ) مبداء اور معاد وغیرہ ایسے مفاہیم ہیں جو عام بشر کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اسطرح کے مفاہیم کے لیے درس و تدریس اور وضاحت و تفسیر کی ضرورت ہے تاکہ عام انسان سمجھ سکے۔

تیسرا سبب: قرآن میں گزشتہ امتوں کے واقعات کا اشاروں کی صورت میں ہونا۔

قرآن مجید میں گزشتہ امتوں کے واقعات اور ان کے حالات و حادثات کو صریحاً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ اشاروں کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان واقعات اور حادثات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والی نسلیں ان واقعات سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔ اب یہ واقعات اور حادثات چونکہ اشارات اور کنایات میں موجود ہیں اس لیے وضاحت اور تشریح کے محتاج ہیں تاکہ انسان اچھی طرح سمجھ کر ان سے نصیحت اور عبرت حاصل کر سکے۔ مثلاً: بنی اسرائیل کے واقعات، قوم عاد و ثمود کا واقعہ، اصحاب کہف کا قصہ وغیرہ۔ اس طرح کے واقعات تفسیر کے محتاج ہیں۔ ارشاد قدرت ہے: و نقص علیک احسن القصص ۔ اور ہم نے آپ کو بہترین قصے بیان کیے ہیں

چوتھا سبب: قرآن کلیات پر مشتمل ہے جزئیات بیان نہیں ہوئے

قرآن مجید نے کچھ امور کو کلی طور پر تو بیان کیا ہے لیکن ان کے مصادیق کو معیّن نہیں کیا۔ اس لئے ان امور کلیہ کو اپنے افراد و مصادیق کی طرف لوٹانا تفسیر کا محتاج ہے تاکہ علم ہو سکے کہ ان امور کے لئے کون کون سے مصادیق اور افراد موجود ہیں۔ ان مصادیق کلیہ کو اپنے مصادیق اور افراد میں معیّن کرنا یا بالفاظ دیگر ان معانی کلیہ کے لیے مصادیق کا تعیین کرنا تفسیر کا محتاج ہے۔ مثلاً قرآن میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے "النسیئُ" یہ محتاج ہے تفسیر کا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ۔ حرمت کے مہینوں میں تقدیم و تاخیر بے شک کفر میں زیادتی کرتی ہے۔

پانچواں سبب: قرآن کی فصاحت و بلاغت

قرآن مجید جس فصاحت اور بلاغت کی زبان میں نازل ہوا اس فصیح اور بلیغ زبان کو عام عربی زبان والا بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔ قرآن کی فصاحت اور بلاغت ایک سبب ہے کہ قرآن کے ان فصیح و بلیغ معانی اور الفاظ کو عام زبان میں بیان کیا جائے۔

یہ وہ پانچ اسباب ہیں جن کی وجہ سے قرآن کی تفسیر کی ضرورت پیش آئی۔[12]

علم تفسیر کے مراحل

علم تفسیر کی تاریخ بیان کرنے کے لیے ہم علم تفسیر کے مختلف ادوار کو مراحل میں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین جب مطالعہ کریں تو ان کے لیے علم تفسیر کی تاریخ کو یاد کرنا اور پڑھنا آسان ہو اور یہ چیز ان کی دلچسپی کا باعث بنے۔ علماء علوم قرآن کی کتب اور کلمات میں غور کریں تو علماء نے تاریخ علم تفسیر کو مندرجہ ذیل چھ مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے ان مراحل کی فہرست تحریر کرتے ہیں اور اس کے بعد ہر مرحلہ کے متعلق تفصیلاً تحریر کریں گے۔

1۔ زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں علم تفسیر، 2- صحابہ کرام کے دور میں علم تفسیر، 3-علم تابعین کے دور میں علم تفسیر، 4-تابعین کے دور میں علم تفسیر 5- علم تفسیر اور اہل بیت علیہم السلام۔ 6- علم تفسیر کی تدوین کے دور میں

یہ وہ چھ مراحل ہیں جن کا استاد ھادی معرفت نے اپنی کتاب التمھید فی علوم القرآن میں ذکر کیا ہے۔[13]

اس کے بعد ہم ان مراحل کو تفصیل سے ذکر کریں گے اور واضح کریں گے کہ علم التفسیر کی ان مختلف ادوار اور مراحل میں کیا حیثیت اور اہمیت رہی ہے۔

پہلا مرحلہ: زمانہ رسولؐ میں علم تفسیر

1۔ بعثت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غرض وغایت

قرآن مجید میں کچھ آیات مجیدہ ہیں جو بعثت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غرض اور مقصد بیان کر رہی ہیں۔ جن میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض قرآن کی تعلیم اور تفسیر بیان کرنا تھی۔ اسی غرض کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّـهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

اسی طرح سورۃ جمعہ میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

وہ ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں آیات پڑھ کر سناتا اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔ پس ان دو آیات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کرنے کا مقصد قرآن کی تلاوت، تزکیہ نفس اور قرآن کی تعلیم و تفسیر بیان کرنا تھا۔

2۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے پہلے مفسر۔

قرآن مجید کا معلّم اوّل اور مفسّر اوّل نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ نحل میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ قرآن آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ آپ اسے بیان کریں۔ اس طرح مفسّر اوّل اور معلم اوّل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتائیں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ ان باتوں میں غور کریں۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ تفسیر آیات مجھ سے پوچھو اور پھر آیات کی تفسیر بیان کرتے تھے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں جب آیات نازل ہوتیں اور تین چار آیات مکمل ہو جاتیں تو رسول خدا ان کی تفسیر بیان کر دیا کرتے۔ مثلاً آیت اقیموا الصلوٰۃ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: صَلُّوا کما رأیتُمُونی أُصلِی۔ نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو۔ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔ اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے۔

اس آیت مجیدۃ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: مناسک حج اور اعمال حج مجھ سے لو۔ میں انہیں بیان کروں گا۔ اسی طرح شریعت میں جتنے احکام عبادات و معاملات فرائض و سنن اخلاقیات و سیاسیات میں وارد ہوئے ہیں وہ سب اس کی تشریح اور تفسیر ہے جو قرآن میں مجمل نازل ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تفسیر اور بیان کے طور پر پیش کی ہیں۔

۳۔ صحابہ کرام اور تفسیر قرآن

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آیات نازل ہوتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحاب کے سامنے ان آیات کی تلاوت کرتے تو اصحاب میں سے جسے کسی آیت کی سمجھ نہ آتی تو وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے اور آیت کی تفسیر معلوم کرتے۔ ابن جریر اپنی اسناد کے ساتھ ابن مسعود سے نقل کرتا ہے۔ ابن مسعود نے کہا: ہم میں سے ہر آدمی جب دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتا تو پھر اس سے آگے اس وقت تک کوئی آیت یاد نہ کرتا جب تک ان دس آیات کے معانی و مفاہیم اور ان کے عمل کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جان نہ لیتا۔

حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ہر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال نہیں کرتا تھا بلکہ کچھ لوگ اس انتظار میں رہتے کہ کوئی ان پڑھ یا سوال کرنے والا آئے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے تو ہم سن کر یاد کر لیں۔ جبکہ مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "جو چیز بھی میرے سامنے آتی تھی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتا تھا، پھر جو جواب ہوتا اسے یاد کر لیتا۔[14]

سوال: کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورا قرآن تفسیر اور بیان کے ساتھ پہنچا دیا ہے؟

جواب: اس میں مختلف اقوال ہیں

۔استاد ذھبی نے پورا ایک باب اس مسئلہ میں ہونے والے اختلاف بیان کرنے کے لیے مختص کیا۔اس میں مندرجہ ذیل اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ قول احمد ابن تیمیہ کا ہے۔پہلا قول یہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے تمام معانی قرآن فرداً اور ترکیبا بیان کر دیے ہیں۔

دلیل: احمد ابن تیمیہ نے دلیل کے طور پر یہ آیت مجیدہ پیش کی ہے:

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ۔ ہم نے آپکی طرف ذکر نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو بیان کرو جوان کی طرف نازل ہوا ہے۔ابن تیمیہ کہتا ہے کہ یہ آیت تمام الفاظ اور معانی کے بیان اور تفسیر کو شامل کرتی ہے۔[15]

دوسرا قول: یہ قول شمس الدین الخوئی (ابو عباس احمد بن خلیل المھلبی الخوئی)، اور السیوطی کا ہے: اس قول کے مطابق قرآن کی تفسیر خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت کم بیان کی ہے۔

دلیل: بزّار نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی تفسیر نہیں کی مگر وہ چند آیات جن کی جبرائیل نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم دی تھیں۔[16]

تیسرا قول: یہ قول علامہ ذھبی کا ہے۔ ذھبی نے دونوں اقوال کا درمیانی راستہ اختیار کیا اور کہا ہے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے قرآن کی تفسیر بیان نہیں کی بلکہ اکثر کی تفسیر کی ہے۔

قرآن کا قلیل حصہ جس کا تعلق اللہ تعالی کے علم غیب اور فہم عرب سے ہے، اسے بیان نہیں کیا ہے۔ذھبی کہتا ہے: بدیہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کا وہ حصہ جس کا تعلق فہم کلام عرب سے ہے اسے بیان نہیں کیا اور جس کا تعلق اللہ تعالی کے علم خاص سے ہے اسے بھی بیان نہیں کیا۔ مثلا قیامت کا علم، حقیقت روح اور وہ علم جو اللہ نے اپنے کسی نبی سے بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ذات سے خاص ہے۔[17]

چوتھا قول: یہ امامیہ کا قول ہے استاد علامہ ھادی معرفت لکھتے ہیں کہ یہ قول صحیح ہے

اور وہ قول یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم کے تمام معانی اپنی امت اور اصحاب کے لیے بیان کیے ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کردہ تفسیر کے چند نمونے۔

گزشتہ بحث سے معلوم ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود قرآن کی تفسیر فرمایا کرتے تھے۔ جبکہ کچھ اصحاب خود سوال کرکے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیات کی تفاسیر معلوم کرتے تھے اور کچھ اصحاب اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرے اور ہم اسے سن کر یاد کریں۔[18]

ذیل میں ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں جن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات میں قرآنی کلمات کی تفسیر اور وضاحت فرمائی۔

پہلا نمونہ: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلمہ السَّائِحُونَ کے بارے میں پوچھا گیا جو اللہ تعالی کے اس قول میں استعمال ہوا ہے: التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّـهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ۔

یہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد پروردگار کرنے والے، راہ خدا میں سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکیوں کا حکم دینے والے، برائیوں سے روکنے والے اور حدود الٰہیہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اے پیغمبر آپ انہیں جنّت کی بشارت دے دیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ھم الصائمون کہ السائحون سے مراد الصائمون یعنی روزہ دار ہیں۔[19]

مجمع البیان میں اس آیت کے ضمن میں روایت نقل ہوئی ہے جس میں کلمہ السَّائِحُونَ کی تفسیر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الصائمون سے فرمائی ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کی سیاحت روزہ ہے۔

علامہ طبرسی نے لکھاہے: کلمہ السائح ساح یسیح سے ہے۔اس کا معنیٰ ہے کہ جب کوئی سیاح زمین میں اپنے سفر کو جاری رکھے مسلسل سفر کرے اسے سیاح کہتے ہیں اور روزہ دار کو سیاح اس لیے کہتے ہیں چونکہ وہ خواہشات نفسانی ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔[20]

دوسرا نمونہ: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے متعلق سوال ہوا: وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔ اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے۔

سئل عن الاستطاعة۔ قال صلی اللہ علیه و آله وسلم الزاد والرّاحلة۔ سوال ہوا کہ اس آیت میں استطاعت سے کیا مراد ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: زاد سفر اور سواری مراد ہے اور یہ کنایہ ہے استطاعت مالی سے۔[21]

تیسرا نمونہ: اسی طرح جب حضرت عائشہؓ نے سوال کیا: اس آیت وَلَكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ میں کسوة سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قال عباءة لكل مسكين۔ ہر مسکین کے لئے ایک عبا ہے۔

چوتھا نمونہ: ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے متعلق سوال کیا: وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ کوئی حج ترک کردے تو وہ کافر ہو جائے گا؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: فقط حج ترک کرنے سے کافر نہیں ہوگا بلکہ حج اس نیت سے ترک کرے کہ کوئی حج نہیں ہے۔اس کا کوئی ثواب وعقاب نہیں ہے۔ یہ چونکہ ضروریات دین سے انکار ہے اس لیے کفر ہے۔[22]

پانچواں نمونہ: قرآن کی سورہ حجر میں موجود آیت 90 اور 91 میں کلمہ عضین کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آمنوا ببعض وکفروا ببعض۔[23]

اس کا معنی یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کو عضین قرار دیا ہے یعنی قرآن کے بعض حصوں پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ.[24]

دوسرا مرحلہ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں علم تفسیر

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اصحاب کرام مسلمانوں کے لیے ایک مرجع کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام صحابہ علم وفضل اور قدر منزلت میں ایک جیسے نہیں تھے بلکہ۔ لھُمْ دَرَجاتٌ عِندَ اللّٰہِ۔ [25]

اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے الگ الگ درجات تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ صحابہ تھے جو علم وفضل میں جلیل القدر تھے اللہ ان سے راضی تھا اور وہ اللہ سے راضی تھے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوا عَنْہُ۔ [26]

ایسے صحابہ کرام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مرجع تھے اور مسلمانوں کے لیے مأویٰ وملجا تھے۔

(صاحب التفسیر والمفسرون) ذھبی کہتے ہیں: حق یہ ہے کہ اصحاب، فہم وادراک کے اعتبار سے مختلف تھے۔ ان میں کچھ اپنی زبان عربی میں بھی برابر نہیں تھے۔ ان میں کچھ تھے جو عربی زبان کے بارے میں وسیع علم رکھتے تھے جیسے حضرت عبد اللہ ابن عباس اور کچھ ان سے کم تھے اس طرح کچھ ہمیشہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔

یعنی ان کا اٹھنا بیٹھنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا جیسے حضرت علی علیہ السلام۔ وہ آیات کے اسباب نزول کو بھی جانتے تھے جن کو ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد ذھبی کہتے ہیں کہ میں اس پر اور اضافہ کروں گا کہ اصحاب کرام علمی مراتب اور علوم عقلیہ کو سمجھنے میں بھی برابر نہیں تھے بلکہ ان میں بہت زیادہ اختلاف تھا۔ [27]

ابوعبیدہ، مجاہد کے واسطہ سے ابنِ عباس کی روایت نقل کرتے ہوئے کہتا ہے: حضرت عبد اللہ ابن عباس نے کہا میں فاطر السموات کا معنی نہیں جانتا تھا یہاں تک کہ دو اعرابیوں کے درمیان جھگڑا ہوا ایک کہہ رہا تھا: أنا فطَرتها کہ یہ کنواں میں نے کھودا ہے اور دوسرا کہہ رہا تھا کہ أنا فطرتها۔

ذھبی کہتے ہیں کہ جب عمر بن خطاب التخوّف کا معنی نہ جانتے ہوں اور عبد اللہ بن عباس فاطر کا معنی نہ جانتے ہوں جو کہ ترجمان قرآن تھے تو پھر دوسروں کا کیا حال ہوگا۔

خلاصہ اور نتیجہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کے دور میں کلمات کی تفسیر معنی اجمالی حد تک ہوئی ہے۔ تفصیلاً آیت کی تفسیر نہیں کی جاتی تھی۔ مثلاً قولہ تعالیٰ: فَاکِہَۃً وأبّاً۔ اللہ تعالی کے اس قول کو معلوم کرنے کے لیے وہ اس بات پر اکتفا کرتے تھے کہ اس سے مراد ان نعمتوں کا شمار ہے جو اللہ تعالی نے انہیں نوازی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پوری آیت کی تفسیر کے ملتزم نہیں ٹھہراتے تھے چونکہ باقی آیت کی تفسیر اور مراد ان پر واضح ہوتی تھی۔

اصحابؓ میں سے مفسرین

علماء میں اختلاف ہے کہ صحابہ کے دور میں مشہور مفسرین کی تعداد کتنی تھی؟ اس میں مندرجہ ذیل دو قول نقل ہوئے ہیں:

پہلا قول: اس قول کو استاد ھادی معرفت نے اپنی کتاب التمہید فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: تفسیر میں مشہور یہ چار اصحاب تھے ان کے برابر کا کوئی پانچواں مفسر نہیں تھا۔

1: علی بن ابی طالب علیہاالسّلام　2: عبداللہ بن مسعود　3: ابیّ بن کعب　4: عبداللہ ابن عباس۔

دوسرا قول: دوسرے قول کے قائل جلال الدین السیوطی کے مطابق مشہور دس ہیں۔ ان میں سے چار خلفاء ہیں، پانچواں عبداللہ بن مسعود، چھٹا ابیّ بن کعب، ساتواں زید بن ثابت، آٹھواں ابو موسیٰ اشعری اور نوواں عبداللہ بن زبیر، دسواں عبداللہ بن عباس ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ خلفاء اربعہ میں سب سے زیادہ تفسیر حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہوئی ہے اور باقی تین خلفاء سے بہت کم بلکہ شاذ و نادر روایت ہوئی ہے۔[28]

البتہ ان کے علاوہ بھی کچھ مفسرین صحابہ کے نام آئے ہیں، مثلاً انس بن مالک، ابو ھریرہ، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر ابن عاص و عائشہ۔ ان کا ذھبی نے ذکر کیا ہے۔

مفسرین صحابہ عندالشیعہ

البتہ ہمارے نزدیک بھی مشہور مفسرین چار ہی ہیں۔ چنانچہ ہم ان کا اجمالی ذکر کرتے ہیں۔

1۔ معانی قرآن کو سب سے زیاد جاننے والے علی ابن ابی طالب علیہاالسّلام تھے

پہلے مفسر قرآن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جن کا اھل بیت میں ذکر ہے اور اصحاب میں بھی، وہ علی ابن ابی طالب علیہاالسلام ہیں۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآن اور تفسیر قرآن جتنا علی علیہ السلام جانتے ہیں اتنا کوئی نہیں جان سکتا۔ اور وہ اس لیے کہ علی علیہ السلام وہ ہیں جنکی پہلی غذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لعاب دہن ہے جو پروردہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور جن کے بارے میں خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :أنا مدینۃ العلم وعلی بابها۔

پھر فرمایا: علی مع القرآن والقرآن مع علی"

یہ دو احادیث کسی ترجمے تفسیر اور حوالے کی محتاج نہیں ہیں۔ جس کے سامنے قرآن نازل ہوا وہی حقیقی تفسیر قرآن بیان کر سکتا ہے۔ اس لیے حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں: میں علی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی مولا بسم اللہ کی تفسیر بیان کیجئے۔ امام علیہ السلام نے تفسیر بیان کرنا شروع کی۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان ہونے لگی اور تفسیر ابھی بسم اللہ کی باء پر تھی۔ میں نے تعجب کیا۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اگر چاہوں تو بسم اللہ کی تفسیر اتنی کروں کہ ستر اونٹ بسم اللہ کی تفسیر سے بھر دوں۔

امام بدرالدین زرکشی کہتا ہے: "صدر المفسرین من الصحابۃ ھو علی ابن ابی طالب ،ثم ابن عباس۔ مفسرین صحابہ میں سب سے اول نمبر حضرت علی علیہ السّلام کا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

حضرت علی ابن ابی طالب علیہاالسلام کی نسبت حضرت عبداللہ ابن عباس سے تفسیر زیادہ روایت ہوئی ہے کیونکہ عبداللہ ابن عباس نے حضرت علی علیہ السلام سے تفسیر لی ہے۔[29]

ذھبی کا قول حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ذھبی کہتا ہے: ''کان علی بحراً من العلم'' حضرت علی علیہ السلام علم کا سمندر تھے۔ صحیح و سالم استنباط میں مضبوط دلیل کے مالک تھے۔ فصاحت خطابت اور شعر میں ماہر تھے۔ باطنی امور میں نافذ البصیرت تھے۔ اور باقی اصحاب بہت زیادہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب

انہیں یمن کا والی بنا کر بھیج رہے تھے تو ان کے لیے دعا فرمائی: اللھم ثبّت لسانہ واھد قلبہ۔اے اللہ ان کی زبان کو ثابت رکھنااور ان کے دل کو مضبوط رکھنا۔

اس کے بعد کہتے ہیں: علی علیہ السلام کیوں اسطرح نہ ہوتے کیونکہ ان کی پرورش نبوت کے گھر میں ہوئی اور ان کی غذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معارف بھرا لعاب دہن ہوتی تھی۔

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباس نے کہا: جب علی علیہ السلام سے کوئی چیز ثابت ہو جاتی تو پھر ہم کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ مسروق کہتا ہے: مدینہ میں عالم علی ابن ابی طالب علیہما السلام (ہی) تھے۔ (جبکہ) عراق کا عالم عبداللہ بن مسعود تھا۔ شام کا عالم ابودرداء تھا۔ (پس) علم ان تین پر ختم ہوتا تھا۔

پھر کہتا ہے: جب یہ تینوں اکھٹے ہوتے تھے تو عبداللہ بن مسعود اور ابودرداء علی علیہ السلام سے پوچھتے تھے لیکن علی بن ابی طالب علیہما السلام نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔[30]

پس ثابت ہوا بلکہ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام مفسرین صحابہ میں سب سے زیادہ اعلم وافقہ تھے اور نہج البلاغہ کے کلمات ان کی گواہی دیتے ہیں۔ ''یَنْحَدِرُ عَنِّی السَّیْلُ، وَلاَ یَرْقَی إِلَیَّ الطَّیْرُ''

جبکہ حضرت علی علیہ السلام خود فرماتے ھیں کہ مجھ سے علم اور حکمت کے دریا بہتے ہیں۔ کوئی پرندہ میرے علم کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

2-عبداللہ بن مسعود: عبداللہ بن مسعود سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ پہلا شخص ہے جس نے مکہ میں قرآن کی آواز بلند کی اور قریش کو قرآن سنایا۔ اسی لیے ان کو اللہ کی راہ میں بہت زیادہ اذیتیں دی گئیں۔

ان کی تربیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کی تھی۔ دو ہجرتیں کیں اور دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اسطرح رہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ہونے والے سب واقعات کا مشاہدہ کیا۔ ہر مقام پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔ قرآن کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے قرآن سننا پسند فرماتے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے متعلق

فرماتے تھے: جو پسند کرتا ہے کہ قرآن کو اس طرح پڑھے جس طرح نازل ہوا ہے تو وہ ابن اُمّ یعنی عبداللہ بن مسعود کی قرات پر قرآن پڑھے۔

3۔اُبی بن کعب: اُبی بن کعب الانصاری الخزرجی کو سید القُرّاء اور سید المسلمین کے لقب سے نوازا گیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مدینہ میں کاتب تھے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو زید بن ثابت لکھا کرتے تھے۔ عہد عثمان میں قرآن ایک قرأت پر اکٹھا کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس کے سربراہ ابی بن کعب تھے۔ ان کی طرف سے تفسیر کا بہت حصہ بیان ہوا ہے اور ان کی طرف تفسیر قرآن کے علمی سلسلے محکم ہیں۔ جلال الدین سیوطی کہتا ہے: ابو جعفر الرازی نے ربیع بن انس اور اس نے ابو عالیہ اور اس نے ابی بن کعب سے ایک نسخہ کثیر روایت کیا ہے اور ان کی اسناد صحیح ہیں۔ اس نسخہ میں سے ابن جریر اور ابن حاتم اور اسی طرح حاکم نے اپنی مستدرک اور احمد نے مسند میں نقل کیا ہے۔[31]

ابو صلاح تقی الدین الحلبی المتوفی (447) نے ذکر کیا ہے کہ ابی بن کعب اور عبداللہ ابن مسعود ان افراد میں سے تھے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وَلاء آل محمد پر ثابت قدم رہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے خاص الخاص افراد میں سے تھے۔[32]

4: عبداللہ ابن عباس: مشہور مفسرین اصحاب میں سے ایک نام حضرت عبداللہ ابن عباس کا آتا ہے جو کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد خاص تھے۔ وہ حبر الأُمّۃ اور ترجمان قرآن اور اعلم الناس بالتفسیر جیسے القاب سے پکارے جاتے تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور فرمایا: ''اللّٰھم فَقِّہْہُ فی الدّین وعلمہ التأویل'' اے پروردگار اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور قرآن کی تاویل سکھا۔

اسی طرح ایک اور دعائیہ جملہ فرمایا: اے پروردگار اسے کتاب اور حکمت سکھا اور دین کی نشرواشاعت میں مبارک قرار دے۔

مسروق کہتا ہے: جب میں عبداللہ ابن عباس کو دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں أجْمَلُ النّاس اور جب وہ بات کرتا ہے تو میں کہتا ہوں أفصح الناس اور جب ان کے متعلق بات ہوتی ہو تو میں کہتا ہوں أعظم الناس قدراً۔[33]

عبداللہ ابن عباس کا طریقہ تفسیر

عبداللہ ابن عباس نے تفسیر کو چار حصوں میں تقسیم کیا:

1 . وہ تفسیر کا حصہ جسکی ہر عرب تفسیر کرے   2. وہ تفسیر کا حصہ جس میں کوئی اپنی جہالت کا عذر پیش نہ کر سکتا ہو

3 . تفسیر کا وہ حصہ جس کو صرف علماء جانتے ہیں   4: تفسیر کا وہ حصہ جس کو صرف اللہ جانتا ہے۔[34]

تفسیر صحابہ اور تفسیر متاخرین میں فرق

1۔ تفسیر صحابہ مختصر تھی جبکہ تفسیر متاخرین مفصل ہے۔

2۔اختلافات اور جدلیات سے پاک تھی کیونکہ خود رسول خدا سے پوچھتے تھے اس لیے اختلاف نہ تھا۔

3۔ تفسیر بالرائے سے پاک تفسیر۔

4۔ قصوں اور اسرائیلیات سے پاک۔

5۔احتمال اور ظنون سے پاک تفسیر۔

تیسرا مرحلہ :تابعین کے دور میں علم تفسیر تفسیر

عہد صحابہ کے بعد تابعین صحابہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروردہ صحابیوں نے علم تفسیر میں محنت کی اور مختلف بڑے بڑے شہروں میں جاکر مدارس قائم کیے جس کے نتیجے میں انہوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں مفسرین قرآن پیدا کیے جنہیں تابعین صحابہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس دور میں پانچ مشہور مدرسے قائم ہوئے جن سے اعلام اور فضلا نکلے اور انہوں نے حفظ قرآن اور تفسیر قرآن میں اپنا حق ادا کیا۔اور وہ علم تفسیر میں مزید جدوجہد کر کے علم تفسیر میں ترقی کا باعث بنے۔

مدارسِ تفاسیر

جید صحابہ کرام نے پانچ بڑے مدارس مختلف پانچ بڑے شہروں میں قائم کیے۔ان پانچ مدارس تفسیر کا ذکر ہم اجمالی طور پر کرتے ہیں:

مدرسہ مکہ: اس مدرسہ کے مؤسس حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس حضرت علی علیہ السلام کے دور میں بصرہ کے والی تھے۔ انہیں حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد بصرہ چھوڑنا پڑا۔ اور آپ نے بصرہ سے ہجرت کر کے حجاز کو مرکز بنالیا اور حجاز میں مدرسہ تفسیر قائم کیا جو آپکی وفات تک قائم رہا۔ آپ کی وفات طائف میں 48 ہجری میں ہوئی۔

ابن تیمیہ کہتا ہے: تفسیر میں لوگوں میں زیادہ اعلم اہل مکہ ہیں کیونکہ وہ اصحاب عبداللہ ابن عباس میں سے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس کے مدرسے سے تعلیم یافتہ اعلام میں سے بڑے نام درج ذیل ہیں:

1: مجاھد 2: عطاء 3: عکرمہ 4: طاووس 5 : سعید ابن جبیر

مدرسہ مدینہ: اس مدرسہ کا قیام مدینہ میں موجود اصحاب عمل میں لائے خصوصاً اُبی بن کعب الانصاری، جن کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے کہ کاتب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سید القراء تھے۔ جمع قرآن کی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ حضرت عثمان کی خلافت میں 30 ہجری میں فوت ہوئے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بارے میں ارشاد فرماتے تھے: "واقرءھم ابی بن کعب" (قاریوں میں سب سے بڑا قاری ابی بن کعب ہے) اس لیے ان کو سید القرّاء کہتے تھے۔ یہ ان افراد میں سے تھے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ولایت محمد و آل محمد پر ثابت قدم رہے۔ اور ان کے مدرسہ مدینہ سے بھی اچھی خاصی تعداد اعلام تابعین کی تیار ہوئی۔

مدرسہ کوفہ: مدرسہ مکہ کے بعد مدرسہ کوفہ ایک اہم مدرسہ تھا۔ معانی قرآن کے حوالے سے یہ انتہائی وسیع مدرسہ تھا۔ جسے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود نے قائم کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص خادم اور پروردہ تھے۔

حذیفہ کہتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے زیادہ قریب حضرت عبداللہ ابن مسعود تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے ہاتھوں بہت سے لوگوں نے کسب فیض کیا۔ ان میں سے اعلام التابعین کے نام یہ ہیں: علقمہ بن قیس النخعی 2: ابووائل شقیق ابن سلمہ الاسدی الکوفی 3: اسود بن یزید 4: مسروق بن اجدع
5: عبیدہ بن عمر السلیمانی 6: قیس بن حازم

اس کے علاوہ اور بہت سے مفسرین مدرسہ کوفہ کے فارغ التحصیل ہیں۔

مدرسہ بصرہ: اس مدرسے کا قیام عبداللہ بن قیس المعروف ابو موسیٰ الاشعری عمل میں لائے۔ جب حضرت عمرؓ نے مغیرہ کو معزول کیا تو ابو موسیٰ اشعری کو والی بنایا اور پھر حضرت عثمان دوبارہ مغیرہ کو واپس لے آئے۔ جبکہ ابو موسیٰ اشعری 17 ھجری میں بصرہ کا والی بنا۔[35]

ابو موسیٰ اشعری نے بصرہ کے لوگوں کو قرآن پڑھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ یہ مدرسہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ مدرسہ 44 ہجری تک رہا، اور 44 ہجری میں ابو موسیٰ اشعری کی وفات ہو گئی۔[36]

یہ مدرسہ شدید انحرافی تھا اس لیے اس مدرسہ کے افاضل اور فارغ التحصیل انحرافی تھے۔ جس کی وجہ سے بصرہ عقائدی، فکری اور سیاسی انحراف کی آماجگاہ بن گیا۔

مدرسہ شام: اس مدرسہ کا قیام ابودرداء عویمر بن عامر الحرزاجی الانصاری عمل میں لائے۔ یہ فقہاء میں سے تھے۔ یوم بدر اسلام قبول کیا اور احد کی جنگ میں بھی حاضر ہوئے۔ حضرت عمر کے دور میں والی دمشق بنے۔ حضرت عثمان کی خلافت میں فوت ہوئے۔ ان کی سنہ وفات 32 ہجری ہے۔

اکابر اصحاب ہمیشہ معزول ہوتے رہے سوائے ابودرداء، بلال بن ریاح اور واثلہ بن اسقع کے۔ ان تین افراد کو کسی نے معزول نہیں کیا۔ واثلہ وہ صحابی ہیں جو دمشق میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔ ان کا سنہ وفات 185 ہجری ہے اور عبدالمالک بن مروان کے دور میں فوت ہوئے۔ ابودردا حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد خاص اور پروردہ تھے۔ قرآن کے اعراب اور نقطے انہوں نے لگائے اور ان کے مدرسے سے اکابر تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت فارغ التحصیل ہوئی۔ جیسے

۱۔ سعید بن مسیّب ۲۔ سوید بن غفلت ۳۔ جبیر بن نصیر ۴۔ زید بن وھب ۵۔ ابوادریس الخولانیؒ وغیرہ۔ ابودرداء ولاء محمد آل محمد پر آخر تک قائم رہے۔[37]

تابعین کی تفسیر کی خصوصیات

تفسیر التابعی کی وہ خصوصیات جو اسے تفسیر صحابہ سے ممتاز کرتی ہیں وہ یہ ہیں:

تابعی کی تفسیر، تفاسیر کی مختلف جہات اور ابعاد میں وسعت اختیار کر گئی۔ تابعین مفسرین نے معانی قرآن میں غور خوض اور دقت سے کام لیااور ان معانی کی تفسیر میں وسعت پیدا کی۔ جبکہ صحابہ کی تفسیر مختصر اور اجمالی ہوتی تھی۔

صحابہ کے دور کی تفسیر کتبی اور تدوینی شکل میں نہیں تھی، بلکہ لوگوں کے سینوں اور زبانوں پر محفوظ تھی۔ جبکہ تفسیر تابعین تدوینی شکل اختیار کر گئی۔ تفسیر تابعی میں النظر والاجتھاد کو شامل کیا گیا جبکہ تفسیر صحابہ روائی تھی یعنی جو انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا وہی یاد کیا۔ تفسیر تابعی کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس تفسیر میں اھل کتاب کی دخالت اور علماء کے تسامح کی وجہ سے اسرائیلیات داخل ہو گئیں جبکہ تفسیر صحابہ اسرائیلیات سے پاک تھی۔ان چار خصوصیات کی بناء پر تفسیر التابعی تفسیر صحابہ سے الگ تھی۔

تابعین کی تفسیر کے منابع

تفسیر تابعی کے مندرجہ ذیل سات منابع نقل ہوئے ہیں:

کتاب کی طرف رجوع: جو کچھ اصحاب اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنچا اسے ملاحظہ کرنا۔

اسباب نزول اور مناسبات کی طرف رجوع۔

لغت کی طرف رجوع: لغت اور خصوصاً اشعار عرب کی طرف رجوع۔اس وقت کے مسلمانوں کے تدوین شدہ مختلف علوم کی طرف رجوع کرنا۔

قرآن میں اپنی فکر اور اجتہاد پر اعتماد کرتے تھے۔

عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہد صحابہ میں تالیف ہونے والی کتابوں کی نصوص پر اعتماد۔[38]

چوتھا مرحلہ: تبع تابعین کے دور میں علم تفسیر

تابعین نے تفسیر میں بہت زیادہ محنت کی اور اپنے شاگرد پیدا کیے اور انہوں نے علم تفسیر میں مختلف جہات سے اور معانی قرآن اور علوم قرآن میں وسعت اختیار کی۔ اختصار کے پیش نظر ہم اکابرین تبع التابعین میں سے چند کے اسماء ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

1.الضحاک بن مزاحم الھلالی 2 . شھر بن حوشب 3 .ابوالجارود 4 .ابو حمزہ ثمالی 5۔ابو نصر العیاشی 6.علی ابن ابراھیم قمی 7.ابو علی الجبّائی 8.ابوحذیفہ النھندی 9:یحیی بن زیاد الفرّاء 10:واصل بن عطاء 11:ابوالمنذر الکلبی 12۔:ابونصر الکلبی 13: ابو مسلم اصفھانی 14. یحیٰی بن کثیر 15: مقاتل بن سلیمان۔[39]

پانچواں مرحلہ تفسیر قرآن اور اھل بیت علیھم السلام

اہل بیت علیہم السلام سے تفسیر کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

پہلا نمونہ: مسح: الف: سر کا مسح:

زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا: اے میرے مولا! کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ میں کیسے جانوں کہ سر کے بعض حصے کا مسح کرنا ضروری ہے؟ امام علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: اے زرارہ! سر کے بعض حصے کا مسح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کتاب خدا میں نازل ہوا ہے پھر زرارہ کو سمجھایا کہ کس طرح آیت وضو کی تفسیر میں مسح ثابت ہے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: وامسحوا برؤوسکم میں برؤوسکم کی باء سے سر کے بعض حصے کا مسح مراد ہے۔[40]

ب۔ پاؤں کا مسح:

مشکل مسائل میں سے ایک مسئلہ جس کے متعلق تفسیر اور ادب کے حوالے سے بہت بحث ہوئی ہے وہ مسئلہ مسح الرجلین ہے۔ آئمہ علیہم السلام کی طرف سے تصریح وارد ہوئی ہے کہ قرآن میں بھی مسح کرنا نازل ہوا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے بھی پاؤں کا مسح بتایا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مسح الرجلین کرکے دکھایا ہے۔ اسی طرح اصحاب اور تابعین کا بھی یہی قول اور فعل رہا ہے۔

سالم اور غالب نے پاؤں کے مسح کے بارے میں سوال کیا تو امام محمد باقر علیہ السلام نے جواب دیا کہ جبرئیل علیہ السلام یہی (پاؤں پر مسح والی آیت) آیت لیکر نازل ہوئے ہیں۔[41]

دوسرا نمونہ۔ قصر والی آیت

قولہ تعالی : وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۔

ترجمہ: جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر نماز کے قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ آیت ہے کہ جس میں اختلاف ہوا ہے کہ صلواۃ کے قصر کا حکم صرف خوف کی صورت میں ہے یا مطلق سفر میں نماز قصر ہے۔

صاحب مجمع البیان علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف خوف کی حالت میں نماز قصر ہے لیکن سفر میں امن کی صورت میں نماز کا قصر ہونا ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جانا ہے۔

اور احتمال ہے کہ اس وقت چونکہ سفر اکثر خوف کی حالت میں ہوتے تھے اس لیے خوف کو قید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور لوگ سفر کرتے وقت دشمنوں سے ڈرتے تھے ڈاکوؤں اور چوروں سے ڈرتے تھے اس طرح کی کئی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔[42]

تیسرا نمونہ: خمس کی آیت:

قال اللہ تعالیٰ :وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ۔(الانفال:۴۱) اور جان لو کہ جو بھی تمہیں غنیمت (فائدہ) حاصل ہو تو بے شک اس میں سے اللہ اور رسولؐ اور ذی القربی کے لیے پانچواں حصہ ہے۔ آئمہ اھل بیتؑ کی طرف سے وارد تفسیر سے غنیمت سے مراد صرف غنیمت جنگ کی صورت میں نہیں ہے بلکہ مطلق غنیمت ہے، چاہے وہ تجارت سے ہو، صناعت اور زراعت سے ہو یا کاروبار سے۔ اس پر خمس ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: غنائم اور فوائد سے مراد ہر غنیمت اور فائدہ ہے جو انسان اپنی زندگی میں حاصل کرتا ہے۔[43]

چوتھا نمونہ: شراب کی حرمت والی آیت:

قولہ تعالیٰ : قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ...(الاعراف ۳۳) اے حبیب کہہ دو بے شک میرے پرورگار نے ظاہر اور باطن گناہوں کو حرام قرار دیا ہے اور اثم اور بغاوت کو حرام قرار دیا... شراب کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ شراب کی حرمت صریحاً ثابت ہے یا نہیں چونکہ لفظ اجتناب آیا ہے کہ شراب سے اجتناب کرو صریحاً حرمت ثابت نہیں ہے۔

اس لیے مہدی عباسی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کہا، کیا شراب اللہ کی کتاب میں حرام ہے تو امام علیہ السلام نے جواب فرمایا ہاں تو اس نے پوچھا قرآن میں کہاں حرمت آئی ہے؟ تو امام علیہ السلام نے اللہ تعالی کا یہ قول (قل انما حرّم رَبّی...۔) پڑھا اور فرمایا کہ اثم سے مراد شراب ہے۔ لہذا یہ آیت شراب کی حرمت پر صریحاً دلالت کر رہی ہے۔[44]

پانچواں نمونہ: تین طلاقیں:

آیت طلاق کے ذیل میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا ایک ہی محفل میں تین مرتبہ طلاق دینے سے تین طلاق شمار ہوں گی یا ایک طلاق شمار ہو گی؟ اکثر مفسرین صحابہ اور اھل بیت اور تابعین و متأخرین کا نظریہ ہے کہ ایک محفل میں تین طلاق ایک شمار ہو گی تین طلاقیں شمار نہیں ہوں گی۔

ایک روایت جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک شخص امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں نے اپنی زوجہ کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں۔ تو امام نے فرمایا: "لیس بشیء" کچھ نہیں ہوا۔ پھر فرمایا: کیا آپ نے قرآن نہیں پڑھا: يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ [45]۔

ترجمہ: اے نبی جب تم اپنی ازواج کو طلاق دو تو ان کی عدت میں طلاق دو۔ اس کا مطلب ہے کہ عدت کے علاوہ دو یا تین طلاق نہیں ہوتیں اور ایک عدت میں ایک طلاق ہوتی ہے۔ امام نے فرمایا: جو کتاب اور سنت کے خلاف ہو اسے کتاب اور سنت کی طرف لوٹا دو۔[46]

چھٹا مرحلہ: علم تفسیر کی تدوین کا دور

عصر ائمہ علیہم السلام کی تفاسیر: صدر اسلام سے ہی قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں فرزندان مکتب اہل بیت علیہم السلام کی قرآنی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے ذیل میں ہم عصر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی چند اہم تفاسیر کا ذکر کرتے ہیں۔ ان تفاسیر کے مطالعے سے جہاں قرآنی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب اہل بیت علیہم السلام کس قدر تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

پہلی صدی کی تفاسیر

۱۔ تفسیر علی علیہ السلام: شیخ مفید علیہ الرحمہ الارشاد میں فرماتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مصحف میں منسوخ کو ناسخ پر مقدم رکھا ہے اور اس میں بعض آیات کی تاویل اور ان کی تفسیر تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔

ابن سیرین کہتے ہیں: کاش اس کتاب تک رسائی ہوتی تو علم کا خزانہ مل جاتا۔

محمد بن سیرین عکرمہ سے نقل کرتے ہیں: اگر اس قسم کی کتاب لکھنے کے لیے جن و انس جمع ہو جائیں تو بھی وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔

۲۔ تفسیر ابن عباس: حضرت عبد اللہ بن عباس حبر امت یعنی " امت کے بلند پایہ عالم" کے لقب سے ملقب ہیں۔

۳۔ تفسیر میثم تمار: تالیف میثم بن یحیٰی بن تمار الکوفی شہید (۶۰ھ)۔

۴۔ تفسیر جبیر: تالیف حضرت سعید بن جبیر شہید۔[47]

دوسری صدی کی تفاسیر

۵۔ تفسیر طاؤس: تالیف ابو عبد اللہ طاؤس بن کیسان الیمانی (متوفی ۱۰۶ھ)۔ آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ احمد بن تیمیہ نے انہیں علم تفسیر میں سب سے زیادہ عالم قرار دیا ہے۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔

۶۔ تفسیر عطیہ: تالیف عطیہ عوفی (متوفی ۱۱۴ھ) آپ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ حضرت ابان بن تغلب ان سے روایت اخذ کرتے ہیں۔

۷۔ تفسیر جعفی: تالیف جابر جعفی تابعی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے خاص اور نہایت قریبی صحابی ہیں۔

حضرت آیۃ اللہ سید حسن صدر فرماتے ہیں: انہوں نے تفسیر لکھی اور اسے امام محمد باقر علیہ السلام سے اخذ کیا۔

۸۔ تفسیر سدی: تالیف ابو محمد اسماعیل بن عبد الرحمن الکوفی القرشی السدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے: تفسیروں میں سب سے عمدہ تفسیر اسماعیل سدی کی ہے۔ آپ کی تفسیر کے راوی ابراہیم بن حکم بن ظہیر انفراری ہیں۔

۹۔ تفسیر عدوی: تالیف زید بن اسلم عدوی) متوفی ۱۳۶ھ(۔ شیخ طوسی نے انہیں اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں شمار کیا ہے۔ اور ابن ندیم نے اپنی الفہرست میں ان کی متعدد تفاسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ تفسیر ابن ابی ھند :تالیف داؤد بن دینار سرخسی (متوفی ۱۳۹ھ)۔ آپ حضرت امام باقر علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ تفسیر ابی بصیر: تالیف: ابو بصیر یحییٰ بن قاسم اسدی (متوفی قبل ۱۴۸ھ)۔ آپ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے معتمد صحابی تھے۔ آپ علمی و فقہی اعتبار سے بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

۱۲۔ تفسیر ثمالی: حضرت ابو حمزہ ثابت بن دینار کوفی ثمالی (متوفی ۱۵۰ھ) آپ حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام صادق علیہم السلام کے خاص صحابی تھے۔ اپنے عہد میں ائمہ اطہار علیہم السلام کے بعد رئیس شیعہ تھے۔ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں، ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نیز نجاشی اور صاحب کشف الظنون نے بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۔ تفسیر مقاتل: تالیف ابوالحسن مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ۔ وہ حضرت امام جعفر صادق (علیہ السلام) کے صحابی تھے۔ یافعی نے امام شافعی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: تمام لوگ تفسیر کے سلسلے میں مقاتل بن سلیمان کے خوشہ چین ہیں۔ ان کی دیگر تالیفات یہ ہیں: الناسخ والمنسوخ۔ نوادر التفسیر۔ کتاب الجوابات فی القرآن۔ الآیات المتشابہات و تشابہ القرآن۔

۱۴۔ تفسیر ابی الجارود: تالیف ابوالجارود زیاد بن منذر (متوفی ۱۵۰ھ) یہ مادر زاد نابینا تھے اور حضرت امام زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہم السلام کے صحابی تھے۔

۱۵۔ تفسیر بطائنی: تالیف علی بن ابی حمزہ سالم بطائنی کوفی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسی کاظم علیہ السلام کے صحابی تھے۔ وہ اپنی تفسیر میں ابو بصیر سے روایت اخذ کرتے تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور الذریعہ نے کیا ہے۔

۱۶۔ تفسیر ھشام کلبی: تالیف ہشام بن محمد بن سائب کلبی۔ ان کے والد متوفی ۱۴۶ھ کی تفسیر کا پہلے ذکر ہو چکا۔ ہشام کی متعدد تفاسیر کا ذکر ابن ندیم نے الفہرست میں اور آقا بزرگ نے الذریعہ میں کیا ہے۔

۱۷۔ تفسیر اسماعیل: تالیف اسماعیل بن زیاد شعیری کوفی۔ شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے ان کو اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ذکر کیا ہے۔ ابن ندیم نے ان کی تفسیر کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۔ تفسیر الجرحی: تالیف ابو وہیب بن حفص الجریری۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ثقہ صحابی تھے۔ ان کی تفسیر کا ذکر الذریعہ نے کیا ہے۔

۱۹۔ تفسیر الجوالیقی: تالیف ہشام بن سالم جوالیقی۔ حضرت امام جعفر صادق اور حضرت امام موسی کاظم علیہما السلام کے صحابی ہیں۔ نجاشی کے مطابق وہ ثقہ ہیں۔ ان کی تفسیر کا ذکر الذریعۃ میں کیا گیا ہے۔

۲۰۔ تفسیر سلولی: تالیف حصین بن مخارق بن عبد الرحمن ورقہ ابو جنادہ سلولی متوفی ۲۰۰ھ۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام حبشی تھا اور وہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ وہ خود امام جعفر صادق اور امام موسی کاظم علیہما السلام کے صحابی ہیں۔ ان کی تفسیر کا ذکر نجاشی اور ابن ندیم دونوں نے کیا ہے۔

۲۱۔ تفسیر ابی روق: تالیف عطیہ بن حارث ہمدانی کوفی تابعی (متوفی ۲۰۰ھ) ان کی تفسیر کا ذکر ابن ندیم، نجاشی اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

۲۲۔ تفسیر واقد: تالیف حسن بن واقد (متوفی ۲۰۰ھ) ان کی تفسیر کا ذکر ابن ندیم اور صاحب الذریعہ نے کیا ہے۔

۲۳۔ تفسیر الحسین: تالیف حسین بن سعید بن حماد اہوازی کوفی (متوفی ۲۰۰ھ)۔ آپ امام رضا اور امام محمد تقی علیہما السلام سے روایت نقل کرتے تھے۔ ابن ندیم نے الفہرست میں ان کی تفسیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک درجن دیگر تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

۲۴۔ التنزیل وکتاب التفسیر :تالیف ابو عبداللہ محمد بن خالد بن عبدالرحمن برقی۔آپ حضرت امام موسیٰ کاظم،امام رضااور امام محمد تقی علیہم السلام کے شاگرد تھے۔ شیخ طوسی نے اپنی الفہرست میں اور علامہ حلی نے اپنی کتاب الخلاصہ میں ان کی تفسیر کاذکر کیاہے۔

۲۵۔ تفسیر منخل :تالیف منخل بن جمیل اسدی کوفی (متوفی ۲۰۰ھ)امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے۔ان کی تفسیر کاذکر نجاشی نے کیاہے۔واضح رہے اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۶۶ پر اس کے فاسدالروایۃ ہونے کاذکر ہو چکاہے۔

۲۶۔ تفسیر الصلت :تالیف عبداللہ ابن صلت تیمی قمی۔ سنہ ۲۰۰ھ تک زندہ تھے۔ حضرت امام رضاعلیہ السلام سے روایت کرتے تھے اور حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے وکیل تھے۔ان کی تفسیر کاذکر نجاشی اور صاحب الذریعہ نے کیاہے۔

۲۷۔ تفسیر اسباط: تالیف ابوالحسن علی بن اسباط بن سالم کوفی (متوفی ۲۰۰ھ) حضرت امام رضاعلیہ السلام کے صحابی تھے اور نجاشی ان کے حق میں لکھتے ہیں: کان اوثق الناس واصدقھم لہجۃ۔

۲۸۔ تفسیر اھل البیت : تالیف ابوالفضل سلمۃ القمی۔ حضرت امام رضااور حضرت امام محمد تقی علیہما السلام کے دور کے علماء میں سے تھے۔ان کی تفسیر کاذکر نجاشی نے کیاہے۔[48]

تیسری صدی کی تفاسیر

۲۹۔ تفسیر یونس :تالیف یونس بن عبدالرحمٰن (متوفی ۲۰۸ھ)۔انہوں نے صفا و مروہ کے درمیان امام جعفر صادق علیہ السلام کی زیارت کی۔ حضرت امام موسی کاظم اور حضرت امام رضا علیہما السلام سے روایت کرتے تھے۔ وہ نہایت جلیل القدر عالم تھے۔

۳۰۔ تفسیر ہمام: تالیف عبدالرزاق بن ہمام بن نافع حمیری یمانی صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ۔) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے جلیل القدر صحابی اور بلند پایہ عالم تھے۔ان کی یہ تفسیر مصر کے بعض کتب خانوں میں آج تک محفوظ ہے۔

۳۱۔ تفسیر محبوب :تالیف ابوالحسن بن محبوب سراد (متوفی ۲۲۴ھ)۔ حضرت امام رضااور امام محمد تقی علیہما السلام کے صحابی ہیں اور حضرت امام صادق علیہ السلام کے ساٹھ اصحاب سے روایت اخذ کرتے ہیں۔ آپ نہایت ہی جلیل القدر عالم تھے۔

۳۲۔ تفسیر مہزیار : تالیف ابوالحسن علی بن مہزیار دورقی (متوفی ۲۲۹ھ)۔ حضرت امام رضا، حضرت امام محمد تقی اور حضرت علی نقی علیہم السلام کے وکیل رہے ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف حروف القرآن بھی ہے۔

۳۳۔ تفسیر دکین :تالیف فضل بن دکین شہید (متوفی ۲۱۹ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر نے اپنی کتاب تاسیس الشیعہ میں کیا ہے۔

۳۴۔ تفسیر فضال :تالیف ابو محمد حسن بن علی بن فضال کوفی (متوفی ۲۲۴ھ)۔ ان کی تفسیر کا ذکر آیۃ اللہ سید حسن صدر اور ابن ندیم نے کیا ہے۔

۳۵۔ تفسیر الفراء :تالیف یحییٰ بن زیاد اقطع بن عبداللہ دیلمی (متوفی ۲۰۷ھ)۔ ان کے والد کا ہاتھ واقعہ فخ میں کٹ گیا تھا اس لیے ان کو اقطع کہتے تھے۔ ان کی تفسیر اور دیگر متعدد تصانیف کا ذکر ابن ندیم نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

۳۶۔ تفسیر العسکری :تالیف ابو علی حسن بن خالد بن عبدالرحمٰن برقی۔ ابن شہر آشوب اور صاحب الذریعہ نے اس تفسیر کا ذکر تفسیر العسکری کے نام سے اس لیے کیا ہے کہ یہ پوری تفسیر حضرت امام علی نقی (علیہ السلام) کی املا کردہ ہے۔ حضرت امام علی نقی (علیہ السلام) کو بھی صاحب عسکر یا عسکری کہتے ہیں۔ یہ تفسیر ایک سو بیس جلدوں پر مشتمل تھی لیکن اس کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔[49]

خلاصہ

قرآن مجید فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ آج تک کوئی اسکا مقابلہ نہیں کر سکا۔ جہاں قرآن کریم فصیح و بلیغ ہے وہاں اپنے اندر عام خاص، مطلق مقید، ناسخ منسوخ اور محکم متشابہ جیسی سنگین پیچیدگیوں پر مشتمل ہے جسکی وجہ سے یہ تفسیر و تاویل کا محتاج ہے اور ایک مفسر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ قرآن خود لاریب ہے اس لیے اس کی حقیقی تفسیر معصوم ہی کر سکتے ہیں تاہم ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں غور و فکر کرنے اور اسے سمجھنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: فَاقۡرَءُوۡا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ، [50] پھر فرمایا: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا۔[51]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: تم میں بہترین انسان وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور پھر دوسروں کو سکھایا۔[52] رسول اللہ نے اپنے اصحاب کو قرآن کی تعلیم دی اور اپنے بعد قرآن کے ساتھ اپنی عترت اہل بیت کو اپنی امت کی

نجات کا ذریعہ قرار دیا۔اس مختصر مقالے کی کوشش سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم اور آئمہ اھل بیت کی تعلیمات کی روشنی میں نزول قرآن سے لے کر آج تک علماء کرام قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ قرآن کو سمجھ کر اس میں بتائے گئے دستور کے مطابق زندگی گزار سکیں۔تاریخ علم تفسیر پر نظر کریں تو ہر صدی میں کتب تفاسیر بھی موجود ہیں اور مفسرین بھی موجود ہیں۔

اسکے باوجود قرآن پاک کی تلاوت تفسیر اور اس پر عمل کا حق ادا نہیں ہوا خصوصاً آجکل کے دور میں علوم قرآن تشنہ بہ تحقیق ہیں۔شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی آجکل کے دور پر منطبق ہو جائے۔قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: سيأتي زمان على امتي لا يعرفون القرآن إلا بصوت حسن..۔رسول گرامی نے ارشاد فرمایا: میری امت پر وہ وقت آئے گا جب قرآن کی پہچان سریلی آواز ہو گی۔یہاں تک کہ رسول خدا روز محشر بھی یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آئیں گے :وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا[53]۔

پس ضرورت اس امر کی ہے کہ علوم قرآن اور خصوصاً تفسیر قرآن میں تحقیق کی ضرورت کو سمجھا جائے۔اللہ تعالیٰ ہماری اس حقیر سی کاوش کو قبول فرمائے اور قرآن پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1]حوالہ جات

1۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن، طبع اولی، مؤسسہ تمہید، قم، ج۹، ص17۔

[2]۔فرقان، آیت 33۔

[3]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن، ج۹، ص17۔

[4]۔برھان فی علوم القرآن 1:13 نقل از علوم قرآن السید محمد باقر الحکیم، ص213۔

[5]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن، ج9، ص17۔18۔

[6]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن، ج9، ص21۔

[7]۔السید باقر الحکیم، علوم قرآن، طبع ثالثہ 2427ھ-2006م، دار الھلال، قم، ص212۔

[8]۔انعام،92۔

[9]۔حدید،25۔

[10]۔مؤمنون،18۔

[11]۔مصدر سابق،ص213۔

[12]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن،ج9،ص18۔19۔

[13]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمہید فی علوم القرآن،ج9،ص153۔

[14]۔المعیار والموازنۃ،الاسکافی،ص304، نقل از تمہید،ج9،ص158۔

[15]۔ابن تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبد الحلیم،مقدمہ اصول التفسیر ابن تیمیہ،طبع ثانیہ(1392ھ-1972م)،ص35۔

[16]۔طبری،محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الشھیر بالإمام أبو جعفر الطبري، تفسیر الطبری،ج1،ص29۔

[17]۔محمد حسین الذھبی ،التفسیر والمفسرون،مکتبۃ وھبیہ،القاھرہ،ج1،ص52۔54۔

[18]۔المعیار والموازنۃ،الاسکافی،ص304 نقل از تمہید،ج9،ص168۔

[19]۔ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم نیشاپوری،مستدرک حاکم،طبع ثانیہ (1422ھ-2002م)۔دار الکتب العلمیۃ،بیروت، لبنان،ج2،ص353۔

[20]۔الطبرسی،امین الاسلام أبو علی الفضل بن الحسن،مجمع البیان،طبع اولی(1427ھ-2006م)،دار المرتضیٰ،بیروت لبنان۔،ج5،ص75۔76۔

[21]۔السیوطی،جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر،الاتقان فی علوم القرآن،چاپ 3 چاپخانہ امیر۔قم المقدس،ج4،ص218۔

[22]۔مصدر سابق،ص218۔

[23]۔مصدر سابق،ص234۔

[24]۔حجر،91۔

[25]۔آل عمران،263۔

[26]۔توبہ،100۔

[27]۔ محمد حسین الذھبی،التفسیر والمفسرون،ج1،ص35۔36۔

[28]۔مصدر سابق،ص63۔64۔

[29]۔الزرکشی،امام بدر الدین محمد بن عبد اللہ،البرھان فی علوم القرآن،ج2،ص157، نقل از التمھید،ج9،ص188۔

[30]۔ محمد حسین الذھبی،التفسیر والمفسرون،ج1،ص89۔

[31]۔السیوطی، جلال الدین عبد الرحمٰن،الاتقان،ج1،ص233۔

[32]۔ تقریب المعارف،ص167، مجلسی،سفینۃ البحار،ج1،ص8، نقل از التمھید،ج9،ص197۔

[33]۔الاصابۃ،ج2،ص330۔334۔اسد الغابۃ،ج3،ص193۔195، نقل از التمھید،ج9،ص298۔

[34]۔ أبو جعفر الطبري، محمد بن جریر بن یزید بن کثیر، تفسیرِ طبری،ج1،ص26 نقل از تمھید،ج9،ص251۔

[35]۔علامہ محمد بن سعد، طبقات ابنِ سعد، مترجم علامہ عبد اللہ العمادی۔ناشر نفیس اکیڈمی،اردو بازار کراچی،ج3،ص198۔

[36]۔ابن حجر عسقلانی، تھذیب التہذیب،ج5،ص362

[37]۔علامہ محمد ھادی معرفت،التمھید فی علوم القرآن،ج9،ص269 ۔273۔

[38]۔مصدر سابق،ص378۔380۔

[39]۔مصدر سابق،ص383۔

[40]۔الکلینی،ابو جعفر محمد یعقوب،الکافی،ج3،ص30۔

[41]۔الطوسی، شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن،الاستبصار، مطبوعہ النجف،1375ھ،ج1،ص54۔

[42]۔الطبرسی، أبو علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان،طبعہ اولی(1427ھ-2006م)،دار المرتضیٰ،بیروت، لبنان،ج3،ص101۔

[43]۔الحر العاملی، محمد بن حسن بن علی بن الحسین، وسائل الشیعۃ،ط بیروت، لبنان، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات۔

[44]۔ الکلینی،ابو جعفر محمد یعقوب،الکافی،ج6،ص406۔

[45] ۔الحر العاملی، محمد بن حسن بن علی بن الحسین، وسائل الشیعۃ، ج15، ص349۔

[46] ۔علامہ محمد ھادی معرفت، التمہید فی علوم القرآن، ج9، ص451۔470۔

[47] ۔شیخ محسن علی نجفی، مقدمہ الکوثر فی تفسیر قرآن، ج1۔

[48] ۔مصدر سابق

[49] ۔مصدر سابق

[50] ۔مزمل، 20۔

[51] ۔محمد، 24۔

[52] ۔محمد ری شہری، میزان الحکمت، ایڈیشن سوم، 2012، مصباح القرآن ٹرسٹ، لاھور، ج8 ص128 حدیث 16158۔

[53] ۔فرقان، 30

اسلام میں حکومت کی ضرورت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں

The Importance of Government in Islam in the Views of the Holy Prophet (SAWS)

سید باقر رضا رضوی
(فاضل جامعۃ الکوثر و متعلم حوزہ علمیہ نجف اشرف)

Abstract
It is undeniable reality that formation of government is very important in human society. Islam as the last Devine religion of God Almighty gives much more importance to this topic. The current study was carried out with the objective to explore the significance of government in the light of the teachings of the Holy Prophet (SAW). Islam is the perfect code of life and the Holy Prophet (SAWS) is the last Messenger of Allah whom was deputed to teach and train the mankind. Allah Almighty as the Creator of the universe sent many Prophets with Devine books to lead the human being towards its perfection and purpose of creation. The Holy Prophet (SAWS) before 14 hundreds year established a Devine government that was completely based on justice, equality, equity, respect, love, and prosperity. It was a unique state that was built with Devine instructions and it comprised all the fundamental and essential laws, values, and principles that were required for an Islamic welfare state. These laws and principles are so comprehensive and complete that can be implemented until the end of this world.

Keywords: Importance, Government, Islam, Views, Holy, Prophet

مقدمہ

"اسلام میں حکومت کی ضرورت" اہم اور بنیادی موضوعات میں سے ایک موضوع ہے چنانچہ موجودہ مقالے میں اس موضوع پر تحقیق کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ آخری آسمانی دین ہونے کی وجہ سے اسلام کلیتاً ایسے قوانین کا حامل ہے جو انسان کی ہدایت کے لئے خداوند عالم کی جانب سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے ہیں۔

چونکہ خداوند عالم انسان کا خالق، سب چیزوں کا عالم اور انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہے لہذا اسکی مصلحتوں کو اچھی طرح تشخیص دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسکی طرف سے نازل ہونے والے قوانین، کامل ترین اور جامع ترین قوانین ہیں جو دنیا و آخرت میں انسان کی سعادت کے ضامن ہیں۔

لیکن محض قوانین نہ توانسان کی زندگی کو سنوارتے ہیں اور نہ ہی اسکی سعادت کی ضمانت لے سکتے ہیں، بلکہ قوانین کے ساتھ کچھ اشخاص کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان قوانین کو عملی جامہ پہنائیں، تب ہی یہ قوانین فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔

حکومت کے لغوی معنی

حکومت کا لفظ ایک بہت ہی اہم لفظ ہے جو سیاسی علوم میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے، اسکے معنی سے آگاہی کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ اسکے لغوی معنی کو سمجھیں، اور اسکے بعد اصطلاحی معنی بیان کئے جائیں۔

لغت میں حکومت،، حکمراں جماعت، ملک، اقبال (نیک بختی)، مملکت و مال کی گردش اور کامیابی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے[۱]

حکومت کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں حکومت کے تین معانی ہیں:

۱۔ حکومت انگلش کے لفظ State کے مساوی ہے، جسکے معنی انسانوں کے اس گروہ کے ہیں جو ایک معین سرزمین پر ساکن ہوں۔ اور ایک ایسی منظم حکومت رکھتے ہوں جو حاکمیت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس تعریف کے پیش نظر، حکومت، چار عناصر پر مشتمل ہے ۱۔ جمعیت ۲۔ سرزمین ۳۔ حکومت ۴۔ حاکمیت۔

۲۔ حکومت کے معنی حکومت اور حکمران جماعت کے ہیں ہے یہ لفظ ان عوام اور اس رعایا کے مقابل ہے، جس پر حکومت کی جاتی ہے۔

۳۔ حکومت یعنی ملک کی حکمران جماعت جس کی ذمہ داری قانون کو نافذ کرنا ہے[۲]

حکومت کی ضرورت

انسان ایک طرف تو اجتماعیت پسند مخلوق ہے یعنی ایسی مخلوق ہے جو اجتماعی زندگی گزارنا پسند کرتی ہے اور معاشرہ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ رہنا اس کی ضرورت بھی ہے، دوسری طرف وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے طاقت، اور قدرت حاصل ہو تاکہ دوسروں پر اپنی برتری کو منوا سکے، ساتھ ہی ساتھ خود غرضی جیسی فطری صفات کا حامل بھی ہے اور وہ ہر چیز اپنے لئے چاہتا ہے یعنی سب چیزوں کو اپنی ذاتی ملکیت تک محدود کرنا چاہتا ہے لہذا انہی خود غرضیوں کی وجہ سے انسانوں کے درمیان، نزاع، لڑائی اور مفادات کے ٹکراؤ جیسی صورت پیش آتی ہے، معاشرے اور سماج کو آپسی نزاع، کشمکش اور جنگ وجدال سے بچانے اور افراتفری کی روک تھام کیلئے ضروری ہے کہ کچھ قوانین موجود ہوں جو انسان کی زندگی کو نظم وضبط نیز انکے روابط کو بہتر بنا سکیں۔ البتہ فقط قانون کا ہونا کافی نہیں ہے چونکہ قانون اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے جب اسکو نافذ بھی کیا جائے ورنہ اسکی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کسی انجمن، تنظیم یا جماعت کا ہونا ضروری ہے جو معاشرے میں قوانین کو نافذ کرے، لوگوں کی اجتماعی اور سماجی زندگی کو نظم و ضبط دے سکے، معاشرہ میں امن و امان قائم کر سکے، اور

معاشرے کی باگ ڈور سنبھالے۔ پس اسی انجمن، تنظیم یا حکمران جماعت کو حکومت کہتے ہیں لہذا معاشرے میں حکومت کا موجود ہونا ضروری چیزوں میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اسکے نہ ہونے کی صورت میں معاشرہ میں لا قانونیت حاکم ہو گی، اور انسانی معاشرہ پستی اور نابودی کی راہ پر چلا جائے گا۔

حکومت کے وجود کی ضرورت کے متعلق قدیم یونانی فلسفی ارسطو یہ کہتا ہے: حکومت انسان کے فطری تقاضوں میں سے ایک ہے کیونکہ انسان فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے اسی وجہ سے اجتماعی اور سماجی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اور جو حضرات حکومت کے قائل نہیں ہیں وہ یا تو وحشی ہیں یا مافوق بشر موجودات ہیں جن کو حکومت کی ضرورت نہیں ہوتی[۳]

یونان کے دوسرے عظیم فلسفی افلاطون "ارنبات" میں انسانی زندگی میں حکومت کے ضروری ہونے کے بارے میں یوں کہتے ہیں؛ انسان کے لئے بافضیلت زندگی اور فضائل و کمالات کا حاصل کرنا حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔[۴]

علم عمرانیات کے بانی ابن خلدون، حکومت کے وجود کو ایک ضروری امر سمجھتے ہیں اور اس کو ثابت کرنے کے لئے انسان کے اجتماعی ہونے یا دوسرے الفاظ میں اس کے فطرتاً سماجی ہونے سے استدلال کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حکومت کا وجود ایک لازم اور ضروری امر ہے[۵]۔

چونکہ انسان حکومت کو زندگی کی سب سے اہم ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھتا ہے، لہذا تاریخ کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں ملے گا جس میں حکومت نہ رہی ہو۔ بہرحال تاریخ کے ہر دور میں حکومت خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو، موجود رہی ہے۔ اگرچہ مختلف صورتوں میں، قبیلہ کی حکومت سے لیکر شہر کی حکومت اور بادشاہت تک، یہاں تک کہ آج کی جدید طرز کی حکومتیں بھی تھیں، لہذا عاقل شخص حکومت کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی حکومت کے مؤسس

بے شمار شواہد و قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے حکومت قائم کرنے والی شخصیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی۔

چنانچہ تاریخی ماخذوں میں جستجو اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ و تحلیل کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی حکومت قائم کی اور ایک حاکم اور سیاسی شخصیت کی طرح حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا، یہاں تک کہ اسلامی ملک کی حفاظت کی خاطر ایک منظم لشکر بنایا۔

آپ نے صلح اور جنگ کے احکام صادر کئے، بعض گروہوں اور قبیلوں سے معاہدے کئے، اقتصادی، اجتماعی اور سماجی پروگراموں کو منظم کیا، گورنر مقرر کئے، دوسرے ممالک کے سربراہان اور قبائلی سرداروں کے پاس سفیر روانہ کئے

دوسرے ملکوں کے بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جس میں لوگوں کے تنازعات اور لڑائی جھگڑوں کے فیصلے اور جرائم کے ارتکاب پر حدیں جاری کی جاتی تھیں، وہیں سے ملک کا نظم ونسق چلایا جاتا تھا۔ آپ خود بھی قضاوت فرماتے اور قاضیوں کو بھی اس کام کے لئے مقرر کرتے تھے[٦]

اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی حکومت کے بانی اور حکومت کی داغ بیل ڈالنے والے تھے۔ آپ نے بذات خود حکومت کا سیاسی اور فکری نظام قائم کیا۔ آپ کی رحلت کے بعد حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گئی۔ اگرچہ بعض لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اسلامی حکومت کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط مسلمانوں کے دینی رہبر تھے، اور آپ نے کوئی حکومت نہیں بنائی تھی، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت نہ صرف مسلمانوں کے دینی رہبر تھے بلکہ اسلامی معاشرے کی سیاسی باگ ڈور بھی آپ کے اختیار میں تھی۔ مذکورہ شواہد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں حکومت کے وجود کا پتا دیتے ہیں۔

جس طرح مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں حکومت موجود تھی اور آپ دینی اور سیاسی رہبر تھے بعینہ وہ غیر مسلم مستشرقین کہ جو اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حکومت کے وجود کو باور کرتے ہیں چنانچہ اٹلی کا ایک دانشمند "فل لینو" کہتا ہے: حضرت محمد نے ایک ساتھ دین اور حکومت دونوں کی بنیاد ڈالی ہے آپ کی زندگی میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔ ماس ارنولڈ اس طرح کہتا ہے : محمد دینِ اسلام اور حکومت کے پیشوا تھے۔ ایک اور مستشرق بنام سٹروٹ مین کہتا ہے۔ اسلام دینی اور سیاسی مذہب ہے کیونکہ اس مذہب کے وجود میں لانے والے نبوت کے علاوہ حکومت کے طور وطریقوں سے بخوبی واقف تھے۔

اسلام ایک سیاسی دین ہے

کسی بھی صورت میں اسلام کو حکومت سے جدا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بغیر حکومت کے اس کے اکثر احکام بے فائدہ ہو جائیں گے جو اسلامی افکار کے خلاف ہے، چونکہ اسلام ایک کامل دین ہے اور اس میں انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے قوانین موجود ہیں، چنانچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے اکثر احکام پر عملدرآمد کئے بغیر چھوڑ دیا جائے جبکہ اسلام میں حکومت کا وجود ضروریات اسلام میں شمار ہوتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ضرورت کو آشکار کیا اور خود قوانین اور احکام کو جاری کرنے اور اسلامی سماج کے امور کو حل کرنے کے لئے حکومت بنانے کا اقدام کیا[٧]۔ اسی وجہ سے اسلام میں دین اور حکومت نہ فقط یہ کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ شہید مدرس کے اعتقاد کے مطابق تو ہماری

سیاست عین دیانتداری ہے، اور اگر اسلام میں دیانت اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا فرض کرلیں تو اسلام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی، جیسا کہ امام خمینی(رح)فرماتے ہیں:

خدا کی قسم! اسلام پورے کا پورا سیاست ہے مسلمانوں نے اسلام کی صحیح تصویر پیش نہیں کی، اسلام ایک تدوین شدہ سیاست ہے جس میں اجتماعی مسائل کا حصہ عبادی مسائل سے کہیں زیادہ ہے، اگر دیکھا جائے تو عبادی مسائل اجتماعی مسائل کی بہ نسبت ایک فیصد یا اس سے کچھ زیادہ ہوں گے، حدیث کی کتاب کا ایک دورہ کہ جو ۵۰/ کتابوں پر مشتمل ہے اس میں فقط تین یا چار کتابیں عبادت سے متعلق ہیں جبکہ باقی تمام اجتماع اور سیاست سے مربوط ہیں۔امام خمینی(رح)دوسری جگہ فرماتے ہیں:
دین اسلام ایک سیاسی دین ہے[۸]۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں حکومت کرنا دین اور حکومت کے رابطہ کی بہترین دلیل ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منصب نبوت کے علاوہ امت کی امامت اور قیادت کا بھی منصب رکھتے تھے اور یہ حکومت کا قائم کرنا من جانب اللہ تھا کیونکہ آپ دین کو کامل طریقے سے جاری کرنے پر مامور تھے اور دین کا بطور کامل جاری کرنا بغیر حکومت کے ممکن نہیں تھا، پس جو لوگ دین کو اخلاق اور آخرت تک محدود کرتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ آخرت اجتماعی روابط کی رہ گزر سے ہو کر گزرتی ہے۔[۹]

اسلام کے قوانین انسان کی زندگی کی سمت کو معین کرتے اور انسان کی زندگی کا لائحہ عمل شمار ہوتے ہیں اور اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مدّ نظر رکھا گیا ہے، جبکہ اجتماعی زندگی میں ان قوانین کو نافذ کرنا حکومت کا محتاج ہے۔لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومت قائم کی تاکہ اسلام کے قوانین کو اجرا کرنے کے ذریعہ مسلمانوں کو دنیا اور آخرت کی سعادت کی ضمانت دے سکیں

پس معلوم ہو گیا کہ اسلام انسان کی زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلوؤں کے لئے مخصوص قوانین رکھتا ہے کہ جس کا وجود حکومت کے وجود کو ضروری بنا دیتا ہے اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ نفس نفیس حکومت کی تشکیل کا اقدام کیا اور یہی اقدام اسلام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی اس حکومت کے وجود کا پتہ دیتا ہے۔
چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد دو اہم کام انجام دیئے

امت مسلمہ کی تشکیل

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے لوگ اور آبادی حکومت کو تشکیل دینے کے اہم ترین عناصر میں شمار ہوتے ہیں کیونکہ اگر آبادی اور لوگ نہ ہوں تو حکومت کے کوئی معنی نہیں ہوں گے اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان اسلامی بھائی چارہ اور امت اسلامی کے نام سے قومی اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ پھر اسلامی نظریات کی بنیاد پر ایک حکومت کی تاسیس کی

کیونکہ امت مسلمہ حکومت اسلامی کی محتاج تھی تاکہ مسلمانوں کے امور کو منظم کیا جائے۔ اور آپ نے لوگوں کے اختیارات کو ہاتھ میں لیتے ہی دو اہم کام انجام دیئے: امت کی تشکیل ۲۔ حکومت کی تاسیس۔

یہ ایک ایسا عظیم سیاسی کام تھا کہ جو مسلسل محنت کے بعد انجام پایا جبکہ قومی اتحاد، حکومت کی بنیاد، سیاسی روابط کی برقراری، داخلی انتظامات، اور اجتماعی نظم وضبط جیسے امور تو عہد رسالت میں ہی انجام پا گئے تھے۔

اسلام میں حکومت کی ضرورت

اسلام ایسا دین ہے کہ جو بشر کی ہدایت کے لئے آیا ہے اور یہ اپنے اندر انسانی معاشرہ میں پیدا ہونے والے تمام واقعات کے لئے قوانین رکھتا ہے۔ اور اسلام انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تمام ضرورتوں پر توجہ رکھتا ہے اور ان کے پورا کرنے پر بھی قادر ہے۔ پس اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسی حکومت ہو جو معاشرے کے امور کو منظم انداز میں چلا سکے۔

اسلام نے حکومت کی ضرورت پر بہت زیادہ تاکید کی ہے اور بہت سے دلائل موجود ہیں کہ جو اسلام میں حکومت کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والی جماعت

انسان ایک معاشرتی اور اجتماعیت پسند مخلوق ہے اور اسلام ایک ایسا آئین ہے جو معاشرہ کی تمام جائز ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ طبیعی بات ہے کہ اگر معاشرے میں حکومت کا وجود نہ ہو تو معاشرہ ہرج ومرج سے دوچار ہو جائے گا۔ کیونکہ انسان ایک طرف تو اپنی برتری چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے منافع کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں سے خدمت لینے کی خواہش بھی رکھتا ہے پس اگر انسان کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے اور معاشرہ میں کوئی قانون نہ ہو تو وہ معاشرہ تباہ وبرباد ہو جاتا ہے۔

پس مفادات کے ٹکراؤ کو کم کرنے، اختلاف اور کینے کی وجہ سے رونما ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں اور جبر وتسلط کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے پر قانون کی حکومت ہو تاکہ لوگوں کی ہوا و ہوس کا سدّ باب کیا جا سکے اور معاشرہ قانون پسند ہو جائے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ہر زمانے میں اللہ کے نمائندے زمین پر باقی رہے، اور انہوں نے جب بھی موقع ملا، زمین پر عدل وانصاف پر مبنی حکومتیں قائم کیں۔ اور معاشرہ میں امن وامان کی فضاء قائم کی۔ اسلام چونکہ الٰہی ادیان میں سے آخری دین ہے جس کے بعد کسی اور دین نے نہیں آنا، اس لیے تاقیامت انسانی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جامع نظام وضع کیا، ساتھ ہی ساتھ ان قوانین کی وضاحت اور حفاظت کرنے والے افراد کو بھی معین کیا تاکہ کوئی حکم مجمل نہ رہے۔ پس جب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی قیادت میں یہ سارے

امور انجام پاتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ائمہ اطہار علیہم السلام نے دین مقدس اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دی۔(۱۰)

قوانین الٰہی کی وسعت ودائرہ

اسلام ایک کامل دین ہے اور اس نے زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی تمام ضرورتوں پر توجہ رکھی ہے اور اس کے لئے احکام و قوانین وضع فرمائے ہیں جو اجتماعی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور انتظامی اور زندگی کے دیگر شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ پس اسلام کے احکام، صرف عبادت پر منحصر نہیں ہیں، بلکہ اس نے کسی بھی فردی اور جزئی مسئلہ کو بھی بیان کئے بغیر نہیں چھوڑا پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک حکومت کہ جس پر بشریت کی ہدایت کی ذمہ داری اور بشر کی زندگی کے اہم مسائل کا حل موقوف ہو اس کے لیے کوئی قانون وضع نہ کیا ہو۔

پس اس کے لیے خود حکومت کا وجود بھی ضروری ہے اور ساتھ ہی ان کے لیے احکام اور قوانین بھی۔ اسلامی قوانین اور احکامات پر ایک سرسری نظر اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ان احکام کی بناوٹ اس طرح سے ہے کہ ان کا جاری کرنا بغیر حکومت کے ممکن نہیں ہے۔(۱۱) جیسے جہاد، قضاوت، لوگوں کے حقوق کا تحفظ حدود وغیرہ کے قوانین ان احکام میں سے ہیں جن کا جاری کرنا حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا ان قوانین کی بناوٹ حکومت کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ، اسلامی معاشرہ کا دفاع، داخلی امن برقرار رکھنا، قضاوت اور اختلافات کا حل، لوگوں کے حقوق کا تحفظ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، بیت المال اور مسلمانوں کے مالی مسائل، خمس، زکات، اور انفال ان مسائل میں سے ہیں کہ جو حکومت کی ضرورت پر واضح دلیل ہیں۔ پس کیا ممکن ہے کہ اسلام ان موضوعات کے لئے جو اسلامی سماج کی اجتماعی اور سیاسی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں ان کے لیے قانون رکھتا ہو لیکن ان کے نافذ کرنے والے ادارے اور نافذ کرنے کی کیفیت کی بابت خاموش ہو؟(۱۲)

دینی پیشواؤں کی عملی سیرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام کی عملی سیرت اسلام میں حکومت کی ضرورت پر تاکید کرتی ہے کیونکہ انھوں نے حکومت بنائی اور حکومت بنانے کی وصیت فرمائی، جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں حکومت بنائی، حضرت علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام حاکم اسلامی رہے۔

قرآن کے دقیق مطالعہ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین پر غور وفکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں دو طرح کی قیادتیں نہیں تھیں کہ ایک قیادت دینی ہو اور ایک قیادت دنیوی،

بلکہ قیادت ایک ہی تھی وہ دنیوی بھی تھی اور وہی دینی کہ جس کا اختیار خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں میں تھا اور آپ ہی مسلمانوں کے مادی اور معنوی امور کے ملجأ وماویٰ تھے۔ (۱۳)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں آپ سے طرح طرح کے مسائل پوچھے جاتے تھے لیکن حکومت کی ضرورت کے متعلق کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا گیا کیونکہ یہ مسئلہ اتنا روشن اور واضح تھا کہ کسی کو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، یعنی حکومت کا وجوب اس قدر بدیہی تھا کہ اس کے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی خدشہ بھی پیدا نہ ہوا کہ اس کو سوال کے ذریعہ دور کیا جائے۔ (۱۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ حکومت

موجودہ صدی کے تحقیق کی اہم موضوعات میں سے ایک موضوع پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کا انداز اور نوعیت کی وضاحت ہے۔ بعض حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ بنیادی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی مخصوص طرزِ حکومت نہیں تھا، اس نظریہ کے مختلف پہلوؤں (خصوصاً کلامی نکتہ نظر) سے جوابات دیے گئے ہیں۔ یہ نظریہ ایک باطل نظریہ ہے اور اس کے خلاف بہت سارے شواہد موجود ہیں۔ راقم ان لوگوں میں سے ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مکمل اور واضح طرز حکومت کے موجود ہونے پر یقین رکھتا ہے۔ اور اس یقین اور عقیدہ کو ثابت کرنے کیلیے پیغمبر اکرم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیاسی، انتظامی، معاشرتی، اور معاشی اصلاحات، قوانین اور عملی نمونے کافی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر لکھی گئی تاریخ کتب میں موجود ہیں۔

مدینہ کی اسلامی حکومت میں مسؤلین وعہدے داروں کے انتخاب کا طریقہ کار

کسی بھی حکومت کے مختلف اراکین ہوتے ہیں، اور حکومتی امور کو چلانے والے افراد ان میں سے اہم رکن ہیں۔ لیکن باصلاحیت اور قابل ترین افراد کی تلاش مشکل ترین کام ہے ۔ اسی رکن کی اہمیت کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ کسی بھی ادارے میں باصلاحیت اشخاص کی پہچان اور ان کو ادارے میں ذمہ داری سنبھالنے کی تشویق اور ترغیب دلانا اس ادارے کے اہم ترین اور مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ (۱۵)

چونکہ افراد سے ہی نظام چلتا ہے اور حکومت کی کارکردگی کا انحصار بھی انہیں نظام چلانے والے افراد پر منحصر ہے، لہذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ افراد کی تشخیص اور شناخت کے لیے کوئی قواعد وضوابط وضع ہوں۔ جب ہم ابتدائی اسلامی حکومت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حکومتی امور کی انجام دہی میں شریک افراد کی تشخیص اور شناخت کے اصولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف صلاحیت، قابلیت، علم، کمال، ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر ہی لوگوں کو مختلف ذمہ داریوں کے نبھانے کے لیے متعین فرمایا، اور زمانہ جاہلیت کے

تمام تر معیارات کو مسترد کر دیا۔ اس وقت کے اسلامی حکومت کے اداروں کے مدیر اور مختلف عہدوں پر فائز افراد مختلف علاقوں، نسلوں، اور قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اوریوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت میں عربی، عجمی، مکی، مدنی، یمنی، مہاجر، انصار، مقامی، اور غیر مقامی سبھی افراد شامل تھے۔

ا۔ عرب و عجم معیار نہ تھے

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب ہیں جبکہ عرب ہی میں اسلام طلوع ہوا اور اسلام کی سب سے پہلی حکومت مدینہ میں وجود میں آئی جو عرب کے شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ جبکہ حکومت اسلامی کے قیام میں اہم کردار ادا کرنے والے اشخاص عرب لوگ ہی تھے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود، عرب ہونے کو فوقیت کا درجہ حاصل نہیں تھا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ(۱۶) اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، اللہ یقیناً خوب جاننے والا، باخبر ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا: تمہارا باپ ایک ہے تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے ہیں بے شک تم لوگوں میں سے جو سب سے زیادہ باتقویٰ ہے وہ ہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باشرف ہے، عرب کو عجم پر کوئی برتری نہیں مگر تقویٰ کے ذریعہ۔(۱۷)

بعض ہم عصر عرب حضرات اسلامی تمدن کو عربی تمدن کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر غیر عرب مسلمانوں نے کوئی ترقی کی ہے تو وہ اس عربی روح کی وجہ سے ہوئی ہے، جو تمام قوموں میں پھونک دی گئی تھی۔(۱۸)

واضح طور پر یہ نظریہ تاریخ کی تحریف ہے، کیونکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے جذبہ اسلام سے سرشار ہو کر قرآن اور رسول اکرم کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ترقی کی نہ کہ عربی روح کی وجہ سے۔ صدر اسلام میں تقویٰ وپرہیزگاری اور علم و کمال معیار عزت وفضیلت تھے، لیکن اموی خلفاء نے عرب برتری کی سوچ کی داغ بیل ڈال دی(۱۹)

اموی سیاست عرب کو عجم پر برتری دینے کی بنیاد پر قائم ہوئی اور امیر شام نے اپنے تمام عمال اور کارندوں کو حکم دیا کہ عربوں کو غیر عرب پر فوقیت دی جائے، اس کے اس عمل نے اسلام پر مہلک ضرب لگائی اور یہی بات اسلامی حکومت کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کا باعث ہوئی۔ (۲۰)

آجری اپنی کتاب اربعین میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث نقل کرتے ہیں: بیشک اللہ نے مجھے اختیار کیا اور میرے لیے میرے اصحاب کو اختیار کیا پھر ان میں سے میرے لیے وزیر قرار دیے۔ کتاب استیعاب میں امام علی

(علیہ السلام) کے قول کے مطابق ان وزیروں کی تعداد چودہ بتائی گئی ہے: حمزہ، جعفر، ابو بکر، علی، حسن، حسین، عبداللہ بن مسعود، سلمان، عمار بن یاسر، حذیفہ، ابوذر، بلال، اور مصعب۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اگر اسی جماعت کو ایک کابینہ کے طور پر فرض کریں (اگرچہ حسنین (علیہما السلام) کم سن تھے) تو اس جماعت میں دو شخص غیر عرب نظر آتے ہیں سلمان فارسی اور بلال حبشی، یہ بات مکمل طور پر عرب نسل کے برتر نہ ہونے کی تائید کرتی ہے۔ان حالات میں جبکہ زمین وزمان عربی رجحان کا تقاضا کر رہا تھا، ان دو اصحاب کرام کے اعلیٰ سطح پر فائز ہونے کا ایک خاص مطلب ہے۔ اور یہاں تک کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلمان کو لقب دیتے ہیں تو سلمان عربی نہیں کہتے بلکہ فرماتے ہیں سلمان محمدی ۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی دو حضرات پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ صہیب بن سنان جن کا لقب ابویحی ہے وہ رومی تھے جو جنگل میں رہتے تھے، (اور بعد میں بستی میں رہنے لگے تھے، ان کو بھی ذمہ داریاں دی گئیں) یہ حبشی ہیں اور انہیں شیعہ اور سنی دونوں صحابی جانتے ہیں، ابن ہشام اپنی کتاب سیرۃ ابن ہشام میں (ابو کبشہ) کو فارسی اور (زید بن حارثہ) کو حبشی جانتے ہیں [۲۱]

یہ دونوں جنگ بدر میں موجود تھے، بعض لوگوں نے (ذو مخبر) کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حبشی اصحاب میں شمار کیا ہے، ان کے درمیان سلمان فارسی جو سلمان الخیر اور سلمان السلام اور سلمان محمدی ہیں کا کردار بہت نمایاں اور کلیدی ہے وہ جنگ خندق میں خندق اور جنگ طائف میں منجنیق بناتے ہیں [۲۲]

اور بعد میں حضرت عثمان کے دور خلافت میں مدائن کے گورنر مقرر ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے ان کو غسل وکفن دیا اور ان پر نماز جنازہ پڑھی۔

کتاب فروغ ابدیت میں آیا ہے: عرب کے خوش گوار آب وہوا والے علاقے، اسلام سے پہلے کی آخری صدی میں مکمل طور پر تین بڑی طاقتوں یعنی ایران، روم اور حبشہ کے ماتحت تھے، اس علاقہ کا مشرقی اور شمال مشرقی حصہ ایران کی حمایت کے تحت، شمال مغربی حصے روم کے تابع اور مرکزی اور جنوب کے حصے حبشہ کے تحت قرار پاتے تھے، بعد کے زمانے میں ان تین حکومتوں کی قربت اور پڑوسی ہونے کی وجہ سے تین عرب حکومتیں حیرہ غسان اور کندہ کے نام سے وجود میں آئیں جن میں سے ہر ایک حکومت مذکورہ تین حکومتوں (ایران، روم اور حبشہ) میں سے ایک کے ماتحت تھیں)۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تینوں حکومتوں کو اسلام کی دعوت دی، خسرو پرویز نے کہ جس کو آنحضرت نے اپنے مبارک خط میں ایران کے عظیم بادشاہ کے طور پر یاد فرمایا ہے، اس نے اسلام قبول نہیں کیا[۲۳] لیکن حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا[۲۴]

اور روم کا عظیم بادشاہ بھی جو قیصر کے نام سے مشہور ہے اسلام لے آیا یہاں پر جو چیز ہمارے لیے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مذکورہ ماخذ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسریٰ اور قیصر روم کو جو خطوط بھیجے ان میں تحریر فرمایا: اسلم تسلم۔ اسلام لے آؤ تاکہ تم سالم اور محفوظ رہو۔ اور بعض خطوط میں مزید تحریر فرماتے ہیں: اسلم تسلم فاجعل ما تحت یدیك(۲۵)

یا تحریر فرماتے تھے: ان تؤمن باللہ وحدہ لا شریك لہ یبقی ملکك[26] ان جملوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلام لے آؤ تو تمہاری حکومت باقی رہے گی۔ پس اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت میں عہدہ داروں کے لیے عرب ہونے کو فوقیت حاصل ہوتی تو غیر عرب حاکموں کو اس قسم کے وعدے نہ دیے جاتے، یہ وعدے گویا حکومت میں عرب محوری یعنی عرب کو عجم پر فوقیت دینے کی نفی اور انکار ہے۔ حبشہ کے بادشاہ کا مسلمان ہونا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید سے اس کا حکومت پر باقی رہنا، نشان دہی کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کا غیر عرب دائرہ بلال جیسے حبشی غلام، اور ذو مخبر جیسے حضرات پر ہی منحصر نہیں تھا بلکہ حبش کا بادشاہ اور خود قیصر روم تک وسیع تھا۔

جو بات ہمارے نظریہ کو زیادہ تقویت دیتی ہے وہ یمن کے بادشاہ اور اسکے تمام کارکنان اور عہدہ دار ہیں جو سب کے سب ایرانی تھے، اور ان سب کا ایک ساتھ ملکر ایمان لانا ہے، اس لیے کہ یمن کی زرخیز زمین جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے اور وہاں کے حکمران ہمیشہ ساسانی (ایرانی) بادشاہوں کے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان کے تمام عہدے دار ایران سے تھے، چنانچہ اس مبارک خط کے ذریعہ جن میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بات پر مشتمل وعدہ کیا تھا کہ (اگر مسلمان ہو جاؤ تو تمہاری حکومت باقی رہے گی)[۲۷]

ان کے رسول اکرم کی جانب سے دی گئی اسلام کی دعوت پر لبیک کہنے کے ساتھ ہی مزید بہت سے ایرانی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کے عہدہ داروں میں داخل ہو گئے۔

اور یہ جذبہ آگے چل کر امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے اس لیے کہ آپ نے بھی (شنسب) نامی شخص کو ہرات کے علاقہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا، جو ایرانی اور غوری نسل سے تعلق رکھتا تھا۔[۲۸]

خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم نے بھی سلمان فارسی کو مدائن کا گورنر مقرر کیا تھا، ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن، سنت، اور سیرت سے عرب محوری یعنی عرب کو عجم پر فوقیت دینے کی نفی ہونا مسلم ہے اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارکان حکومت کا انتخاب کرنے میں کبھی بھی عرب لوگوں کو ایک انسانی قوت کا ماخذ اور ذریعہ ہونے کی حیثیت سے فوقیت کا درجہ نہیں دیا۔

۲۔ عہدے داروں کے انتخاب میں شہر اور مقام کی حیثیت

مکہ معظمہ کی عظمت وہاں پر بسنے والوں سے ہی مخصوص نہیں ہے ، بلکہ وہ ایک ایسا مقدس مقام ہے جو سب مسلمانوں سے مربوط ہے، لیکن حکومت کا مرکز قرار دینے کے اعتبار سے اس کی الگ حیثیت ہے چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصلی وطن واپس پہنچے تب بھی آنحضرت نے اس کو دارالحکومت قرار نہیں دیا، بلکہ واپس مدینہ تشریف لے گئے، اسلامی حکومتوں کی تاریخ میں مکہ معظمہ کبھی بھی دارالحکومت نہیں ہوا ہے اسکی وجہ ہم پر واضح نہیں ہے۔ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عتاب بن اسید کو والی مکہ بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوبارہ مدینہ منورہ تشریف لائے (۲۹)۔ واضح رہے اس شخص کو اس لیے مکہ کا والی نہیں بنایا تھا کہ وہ مکی ہے بلکہ ان کو ان کی صلاحیت اور لیاقت کی وجہ سے مقرر فرمایا۔ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت میں وزیروں اور گورنروں نیز عہدہ داروں کے انتخاب میں کسی شہر کو فوقیت نہیں دی گئی بلکہ تمام تر انتخاب ان افراد کی ذاتی صلاحیت، علم اور کمال کی بنیاد پر تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ خصوصاً (عثمان بن طلحہ بن شیبہ) جو وراثت کے طور پر کلید بردار ہوتے تھے تو پیغمبر نے ان کو اسی منصب پر کیوں باقی رکھا (۳۰)

ہمارے نزدیک یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ مکہ کے رہنے والے تھے بلکہ امانت واپس لوٹانے کے عنوان سے ان کو اس منصب پر باقی رکھا گیا تھا کیونکہ یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ (اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ) (۳۱)۔ بے شک اللہ تم لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل کے سپرد کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو۔

مدینہ (ہجرت سے پہلے جس کا نام یثرب تھا) اسلامی حکومت کا مرکز رہا ہے نیز یہ شہر بہت سے نیک اور پاک و پاکیزہ لوگوں کا مدفن ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شہر کو دارالحکومت بنانے کے لیے مکہ معظمہ پر بھی ترجیح دی یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد بھی دارالحکومت کو نہیں بدلا۔

لیکن اہل مدینہ کیونکہ مدینہ میں رہتے ہیں تو کیا اس وجہ سے انہیں کوئی امتیاز یا دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل ہے ؟ کیا حکومت اسلامی میں اہم ذمہ داروں کے انتخاب کے لیے یہ کوئی معیار ہو سکتا ہے ؟ اس سوال کا جواب بھی منفی ہے اس لیے کہ وزیروں کی فہرست میں جو دیکھا گیا ہے تو فقط ایک شخص مدنی ہے اور وہ زیاد بن لبید انصاری ہیں۔ اور اہل یمن جو نہ مکی ہیں اور نہ مدنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت کے گورنروں میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور مہاجرین بھی جن میں مکی اور غیر مکی دونوں حضرات موجود تھے، وہ بھی حکومت کے منصبوں پر فائز تھے۔

۳۔ عہدے داروں کے انتخاب میں قوم اور قبیلہ کی حیثیت

قریش ایک قبیلہ کا نام ہے اس قبیلہ کے جد نضر بن کنانہ ہیں، یہ قبیلہ حرم خانہ کعبہ کے اطراف میں آباد ہو گیا تھا۔ اموی، علوی اور عباسی قبیلہ قریش سے ہیں رسول خدا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی قریشی ہیں اور سب سے بڑا افتخار کسی شخص کے لیے یہ تھا کہ وہ اس قبیلہ کی کسی شاخ میں شمار یا اس سے منسوب ہو جائے، یہ بات ملحوظ رکھتے ہوئے کہ عرب معاشرہ ایک موروثی عارضے میں مبتلاء تھا اور وہ یہ کہ عرب معاشرہ گھرانہ، خاندان اور قبیلہ کے نام پر فخر کرتا تھا، لہذا یہی انداز فکر ممتاز قبیلہ (قریش) کی برتری کیلیے زمینہ فراہم کرتا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بذات خود قریشی تھے مذکورہ عارضے کو پہچان کر اس کے مزید خطرناک ہونے سے پہلے ہی اس کا علاج کیا اور ان سے پہلے خود قرآن مجید نے، شعوب اور قبائل کو ایک دوسرے کی شناخت اور پہچان کا سبب قرار دیا یعنی ایک دوسرے پر فخر کا باعث قرار نہیں دیا: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ[۳۲]۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا پھر تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک یقیناً وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، اللہ یقیناً خوب جاننے والا، باخبر ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت مکہ کو فتح کیا تو قریش کو اس عارضے سے بچانے کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا: بندوں میں بہتر بندہ وہی ہے جو صاحب تقویٰ ہو[۳۳] اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں: میری قوم کے افضل اشخاص، حاملان قرآن اور شب زندہ دار حضرات ہیں[۳۴]

اس کے علاوہ اس مقام پر جہاں کفار کے مقتول من جملہ ابو جہل، عتبہ، شیبہ، اور امیہ، جو گڑھے میں پڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے خطاب کے دوران ارشاد فرمایا: (دوسروں نے میری تصدیق کی.... دوسروں نے مجھے پناہ دی اور دوسروں نے میری مدد کی)[۳۵] یہ دوسرے کون لوگ ہیں کہ اس قدر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام میں بار بار آ رہے ہیں، یعنی غیر قریش کہ جو مہاجر، انصار اور مکی مدنی سب ملے جلے ہیں۔

کتاب (ذکری) میں آیا ہے کہ بعض فقیہ جیسے شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے والد بزرگوار وغیرہ نے میت کی بحث میں ہاشمیوں کو فوقیت دی انکو انہی روایات سے استفادہ کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا، حالانکہ ہماری روایات میں ان روایات کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔[۳۶]

چنانچہ ہم کہیں گے:

اولاً۔ تو یہ کہ یہ روایتیں سند کے اعتبار سے معتبر نہیں ہیں، اس لیے کہ شیعہ سلسلہ سند میں ان کی کوئی سند نہیں ہے۔

ثانیاً۔ یہ کہ اگر اسی اہلسنت کے سلسلہ سند سے ان روایات کو قبول کر بھی لیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے حذیفہ یمانی کو جو قریشی نہیں ہیں ایک نماز میں مقدم کرنے سے یہ روایات ناقص ہو جاتی ہیں، جبکہ ان (حذیفہ یمانی) کے پیچھے نماز پڑھنے والے ماموین قریشی تھے، یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قریشیوں کا امام قرار دیا اور ان پر مقدم کیا، لہذا بعض حضرات جیسے (عیاض) اس تناقض کو حل کرنے کے لیے جلدی سے یہ توجیہ پیش کر دیتے ہیں کہ قریش کو غیر قریش پر مقدم کرنے سے مراد خلافت و حکومت میں مقدم کرنا ہے نہ کہ نماز جماعت یا نماز میت میں مقدم کرنا[۳۷]

ثالثاً۔ یہ کہ اگر قریش کو مقدم ہونا چاہیے تو فقط بنی ہاشم مراد ہیں کہ اس بات کو ہم بھی قبول کرتے ہیں، چونکہ قریش نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دی انہیں مکہ سے باہر نکال دیا ان کے ساتھ جنگ کی، پھر بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں مقدم کیا جائے وہ سب کے معلم ہو جائیں اور کوئی دوسرا انکا معلم نہ ہو سکے؟

رابعاً۔ اگر ان سب سے چشم پوشی کر لیں تب بھی ان روایات کی دلالت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول سے ٹکرا رہی ہے یعنی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدمقابل قرار پا رہی ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: لاحسب لقرشی ولا عربی الابالتواضع۔

نیز سورۃ حجرات کی تیرہویں آیت سے اور مکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ (جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے) سے تعارض رکھتی ہیں اور کلی طور پر اس قسم کی روایات قریش کی فوقیت کو ثابت نہیں کر سکتی ہیں۔[۳۸]

۴۔ عہدے داروں کے انتخاب میں ہجرت کی اہمیت

الف۔ مہاجرین: مہاجرین سے مراد وہ فداکار لوگ ہیں جنہوں نے صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ یا آنحضرتؐ کے بغیر مکہ سے مدینہ یا حبشہ کی طرف ہجرت کی اور قرآن مجید میں خود ان کی اور ان کے عمل کی مدح بیان ہوئی ہے۔ جبکہ ہجرت کی اہمیت اور قدر و قیمت کے لئے یہی کافی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام جب معاویہ یا دوسرے لوگوں کی طرف خط لکھتے ہیں تو ان متعدد خطوط میں ہجرت کا اپنی حقیقی فضیلت کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرماتے ہیں: سبقت الی الایمان والھجرۃ[۳۹] یا ارشاد فرماتے ہیں: لیس المھاجر کالطلیق[۴۰] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکومتی عہدہ دار بلکہ اصحاب اور تربیت یافتہ لوگوں میں زیادہ تعداد مہاجرین کی تھی، جنگ بدر میں ابن ہشام کی بیان کردہ تعداد کے مطابق

۸۷،اشخاص مہاجر تھے۔(۴۱) جنگ بدر سے پہلے، حملہ کی اطلاع اور معلومات کے فرائض مہاجرین ہی انجام دیتے تھے۔چونکہ انصار نے پیغمبر اسلام کی حفاظت کا معاہدہ فقط مدینہ کے اندر کے لئے کیا تھا مدینہ سے باہر کے لئے نہیں۔(۴۲)

پیغمبر اکرم کی جانب سے اکثر ذمہ داریاں مکی یا قریشی یا بنی ہاشم یا ذی القربی کے عنوان سے جن لوگوں کے سپرد کی گئی تھیں انہوں نے ہجرت بھی کی تھی، اور ہجرت کو قرآن کے لحاظ سے بھی اور رسول اللہ کی نظر میں بھی ایک اہمیت اور یقینی فوقیت کا درجہ حاصل ہے۔یعنی ارکان کا انتخاب کرنے میں مہاجرین کو فوقیت حاصل ہے۔اب رہا یہ سوال کہ اس وقت مہاجر کا مصداق کون ہے؟ تو اس سلسلہ میں مفسرین اور مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے اور دو قول ہیں: پہلا قول: فتح مکہ کے بعد ہجرت ختم ہو گئی، دوسرا قول: جب تک کفر باقی ہے ہجرت بھی باقی ہے یعنی جب تک کفر رہے گا ہجرت بھی جاری رہے گی۔

پہلے قول کی دلیل رسول اسلام کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: لا ھجرۃ بعد الفتح اور یہ کہ فتح مکہ کے بعد، مکہ دار الکفر سے دار الایمان میں بدل گیا ہے۔اب مکہ سے مدینہ آنے کا مطلب ہجرت نہیں ہے۔

اور دوسرے قول کی دلیل یہ ہے کہ ہجرت سے مراد دار الکفر سے دار الایمان کی طرف ہجرت کرنا ہے فقط مکہ سے مدینہ جانا مقصد نہیں ہے اور صاحب جواہر کے دعوے کے مطابق اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے(۴۳)۔

ب۔انصار: مہاجرین کی طرح انصار بھی پیغمبر اکرمؐ کے لئے، افرادی قوت بڑھانے کا ذریعہ تھے۔نیز ان کو فوقیت اور اہمیت حاصل تھی اور انصار کا لقب بھی انہیں قرآن مجید نے عطا کیا ہے۔چنانچہ کتاب کشاف میں بیان ہوا ہے کہ رسول خدا نے انصار اور مہاجرین کے درمیان کیسے فضیلت کے بارے میں مساوات قائم کی یہاں تک کہ بعض انصار خود کو قریش سے برتر و افضل سمجھتے تھے۔

پیغمبر اکرم نے مہاجر اور انصار کے سامنے خوبصورت، اور منصفانہ بیان میں اشارے کے طور پر دونوں گروہوں کی فضیلتوں کا تذکرہ اور دونوں کو اپنے دو بازو کی حیثیت سے قرار دیا اور خندق بناتے ہوئے بیلچہ مارتے وقت یہ نعرہ لگایا:

(اللھم اغفر الانصار و المھاجر)۔اے اللہ! مہاجر اور انصار کی مغفرت فرما۔

واضح رہے کہ آپ کی یہ گفتگو نصرت اور مدد کے بارے میں ہے جس کا اعلیٰ درجہ ایثار اور قربانی ہے۔نصرت و مدد کی اس قدر اہمیت ہے کہ ہر شخص انصاری کے لقب کو ایک تمغہ کی طرح اپنے سینے پر سجائے ہوئے تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔انصار اسی طرح تاریخ میں "آخری امت میں سچی زبان (وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ)" والوں کی صورت میں باقی رہے ہیں۔

جابر ابن عبد اللہ انصاری، جنادہ انصاری، ابو ایوب انصاری، ابو دجانہ انصاری وغیرہ یعنی وہی فضیلت جو سادات اور بنی ہاشم کو حاصل ہے اور اپنے نام میں سید کا لفظ لگا کر خود کو ممتاز کرتے ہیں۔انصار بھی اپنے نام کے آخر میں انصاری کا لفظ لگا کر ایسا ہی کرتے ہیں۔

جنگ بدر، فتح مکہ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری جنگوں اور غزووں میں انصار قابل ملاحظہ طور پر موجود تھے اوران کی تعداد مہاجرین سے بھی زیادہ تھی۔ (۴۴)

ج۔ تابعین : خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (۴۵)۔ اس آیت میں رسول خدا کے مددگاروں میں سے تین گروہوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جنہیں اللہ کی رضایت وخوشنودی حاصل تھی۔ یہ تین گروہ درج ذیل ہیں : ۱۔ مہاجرین ۲۔ انصار ۳۔ تابعین۔ تابعین کے بارے میں دو نظریات ہیں

پہلا نظریہ۔ یہ ہے کہ انہوں نے پیغمبرؐ کو درک نہیں کیا بلکہ بعد میں آئے اور انہوں نے دوسرے معصومین کی مدد کی۔
دوسرا نظریہ۔ یہ ہے کہ یہ سابقین (مہاجر والانصار) یعنی اپنے سے پہلے والوں کے تابع ہوگئے۔ (۴۶)

دوسرے نظریہ کے مطابق تابعین وہ لوگ ہیں کہ جو یا مہاجر ہیں یا انصار۔ البتہ دیر سے اس قافلہ نور سے ملحق ہوئے ہیں۔ لیکن (وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ)۔ اور مہاجرین وانصار میں سے جن لوگوں نے سب سے پہلے سبقت کی اور جو نیک چال چلن میں ان کے پیرو ہوئے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے یہی عظیم کامیابی ہے

د۔ مجاہدین: عام طور پر جہاد کا تذکرہ مہاجرین اور انصار کے ساتھ ہوا ہے بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ جس چیز کی وجہ سے مہاجرین وانصار کو فضیلت ملی ہے وہ ان کا جہاد ہی تو ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۴۷)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور انہوں نے اپنے اموال سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

یا ارشاد فرماتا ہے: وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۴۸)

اور جو لوگ ایمان لائے اور مہاجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا نیز جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔

یعنی ہجرت اور نصرت کی طرح جہاد کو بھی بڑی فضیلت حاصل ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات اس کے بارے میں موجود ہیں جیسے (مومنون حقاً)(رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ) اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی،(لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ) ان کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً [۴۹] اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ زیادہ رکھا ہے۔

خلاصہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی چار عنوان یعنی مہاجرین، انصار، تابعین اور مجاہدین ہیں جو ایک مآخذ اور با فضیلت مجموعہ کی منظر کشی کرتے ہیں نیز ان کو قربانی دینے والوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رسول خدا قرآنی نص کے مطابق انہیں اہمیت اور ترجیح دیتے ہیں۔ لہذا اس بنا پر قربانی و ایثار کرنا رکنیت یعنی ارکان منتخب کرنے کے لئے دوسرا معیار ہے۔ اسلامی حکومت کو چاہئے کہ اپنی طاقتوں اور ضرورتوں کو ان چار عظیم گروہوں سے پورا کرے اور اگر جنگ نہ ہو تو ایثار و قربانی پیش کرنے والے مہاجرین، انصار، اور تابعین وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اسلام و اسلامی حکومت کے لئے سب سے زیادہ رنج و مشقت برداشت کیں ہیں۔ جن کا ماضی ایثار و قربانی، ہمدردی اور جہاد سے درخشاں و تابناک ہو یعنی جنہوں نے سب سے زیادہ ایثار و قربانی، ہمدردی اور جہاد کیا ہو۔

خلاصہ

کسی بھی حکومت اور ملک کو چلانے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہیں: قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والے افراد۔ اسلام آخری آسمانی دین اور ایک مکمل و جامع ضابطہ حیات ہونے کے ناطے تا قیامت انسانی معاشرہ کے استحکام اور بقاء کے لیے ضروری بنیادی اور ضروری قوانین کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسے اشخاص اور افراد کی بھی نشاندہی کی ہے جو ان پر صحیح معنوں میں عمل کروا سکتے ہیں۔

جہاں انسان رہتا ہے وہاں مفادات اور ترجیحات کا ٹکرانا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اس کے حل کے لیے حکومت کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ معاشرہ میں نظم و ضبط اور امن و امان برقرار رہے، کیونکہ نظم و ضبط اور امن و امان کے بغیر زندگی مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے، پس لوگوں کی ایک جماعت ہونی چاہیے جو معاشرہ میں امن و امان اور نظم و ضبط برقرار رکھ سکے، پس یہی جماعت حکمران یا حکومت کہلاتی ہے۔

حکومت کی ضرورت عقلی ہونے کے ساتھ ساتھ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دینی پیشواؤں کی سیرت عملی سے بھی ثابت ہے۔ اسلام میں حکومت کا وجود ان بنیادی موضوعات اور مسائل میں سے تھا اور ہے کہ جو ہمیشہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلامی معاشرہ کے رہبروں اور مفکرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ بتاتی ہے حکومتی امور کی انجام دہی کے لیے، ایماندار، متقی، باصلاحیت، باکمال اور مخلص افراد کا چناؤ بہت ضروری ہے۔ عہدے داروں اور مسؤلین کے انتخاب میں ایمان، علم، خلوص اور تقوی کو ملاک ومعیار قرار دینے کی بجائے لسانی، قومی، نسلی اور علاقائی تعلق کو ملاک ومعیار بنانا سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے منافی عمل ہے جس کی دین مقدس اسلام اجازت نہیں دیتا۔

حوالاجات

1۔ فلسفہ سیاست /تدوین: موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینی (رہ)، قم، ۱۳۷۷، ص ۸۲۔
2۔ حوالۂ سابق۔
3۔ حوالۂ سابق، ص ٦٦۔
4۔ جمہوری افلاطون، ترجمہ فواد روحانی۔
5۔ مقدمہ ابن خلدون، علامہ عبدالرحمن ابن خلدون، نفیس اکیڈمی، اردو بازار کراچی، 2001، ص ۴۱۔۴۲۔
6۔ جعفر سبحانی، مبانی حکومت اسلامی، ترجمہ ونگارش: داؤد الہامی، انتشارات توحید، قم، ۱۳۷۰، ص ۱۳۔
7۔ حوالۂ سابق۔
8۔ محمد سروش، دین ودولت در اندیشہ اسلامی، مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۷۸، ص ۱۹۲۲۔
9۔ فلسفہ سیاست /تدوین، موسسہ آموزشی پژوہشی امام خمینی (رہ)، قم، ۱۳۷۷، ص ۲۰۔
10۔ صحیفۂ نور، ج ۲۱، ص ۱۷۸۔
11۔ حوالۂ سابق، ج ۹، ص ۱۳۸۔
12۔ حسین جوان آراستہ، مبانی حکومت اسلامی، مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۷۸، ص ۲۲۔
13۔ محمد ہادی معرفت، مجلہ حکومت اسلامی، سال دوم/شمارہ ۴/ زمستان ٧٦، ص ۱۴۔
14۔ محمد یوسف موسیٰ، نظام الحکم فی الاسلام، ص ۱۴۔
15۔ حسن ستاری، مدیریت منابع انسانی، ص ۹۱۔
16۔ حجرات، 13۔
17۔ علامہ باقر مجلسی، بحار الانوار، ج 76، ص 350۔
18۔ مرتضی مطہری، خدمات متقابل اسلام وایران، ص 288۔289۔
19۔ حوالۂ سابق، ص 406۔
20۔ حوالۂ سابق، ص 412۔
21۔ ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک، سیرۃ النبویۃ، ج 2، ص 333۔

22۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ص126،360۔
23۔ علامہ باقر مجلسی، بحار الانوار، ج20، ص389۔
24۔ حلبی، نور الدین علی ابن برہان الدین حلبی، سیرت حلبیہ، ج3، ص279۔
25۔ طبقات کبریٰ، ج2، ص235۔
26۔ حوالۂ سابق، ص222۔
27۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ج2، ص222۔
28۔ مرتضیٰ مطہری، خدمات متقابل اسلام و ایران، ج2، ص393۔
29۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ص352۔
30۔ حوالۂ سابق، ص338۔
31۔ نسا، 58۔
32۔ حجرات، 13۔
33۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ج2، ص472۔473۔
34۔ مجلسی، علامہ باقر مجلسی، بحار الانوار۔ ج65، ص456۔
35۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ج2، ص512۔
36۔ سیرت ابن ہشام، ج2، ص363۔
37۔ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، ج1، ص480۔
38۔ جواہر الکلام، ج21، ص26۔
39۔ باقر مجلسی، بحار الانوار، ج11، ص28، ج67، ص302، ج67، ص358.۔
40۔ شیخ سعید زین الدین بن علی، روضۃ البہیۃ، ج1، ص392۔
41۔ امام زین العابدین علیہ السلام، صحیفہ سجادیہ۔
42۔ نسا، 100۔
43۔ عنکبوت، 56۔
44۔ ابو محمد عبد الملک بن ھشام بن ایوب حمیری، سیرت ابن ہشام، ج2، ص363،615۔
45۔ توبہ، 100۔
46۔ ملا فتح اللہ کاشانی، منہج الصادقین، ج9، ص234.
47۔ انفال، 72۔
48۔ حوالۂ سابق، 74۔
49۔ نساء، 95۔

معاشرتی انصاف سیرت امیر المؤمنینؑ کی روشنی میں

Social Justice in light of Seerat e Ameer ul Momineen (A.S)

محمد عباس کمیلی
(متعلم جامعۃ الکوثر، اسلام آباد)

Abstract

Justice is the need of every society and no society can survive without justice. Justice is the one of those elements that are accepted by all people regardless of religions, casts, tribes, races, and countries. In a state, where justice governs people live with peace, harmony and prosperity even those people who are tyrants. Injustice leads towards hates, instability, extremism, and destruction. Imam Ali (A.S) was a symbol of justice who not bestowed against oppressors, nor did he accept any corrupt person during his government. He tried his best to establish a government that completely base on the real and true teachings of the Holy Quran and the Holy Prophet Muhammad (S.AWS). He introduced many social reforms and emphasized faire distribution of Bait ul Mall and not allowed anyone to get more on basis of political, social or any other affiliation, he focused on the implementation of justice at all levels and never compromised in this regard, as it is said. In addition, he appointed judges on merit basis with complete instructions that no one is allowed to give verdict by skipping and ignoring the teachings of Quran and Holy Prophet (SAWS). He instructed all his commanders and other members of his government to insure social justice and he also announced many times that the purpose of government is to protect the rights of public.Moreover, he strictly implemented economic and social reforms and set an example of true Islamic government that completely based on Devine teachings, merits, quality and equality. He preferred to be martyred but not compromised. At the end, he was martyred in the Kofa Mosque due to his justice.

Keywords: Social, Justice, Seerat, Ameer ul Mmominnen

مقدمہ

زمانہ قدیم سے انسانوں پر بادشاہی نظام مسلّط رہا ہے جس کے نتیجہ میں حکمران طبقہ نے اقتدار و حکومت کا عادی ہو کر یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ محکوم طبقہ ان کی خدمت کے لیے ہی خلق ہوا ہے، اس کے ساتھ ساتھ محکوم اور پسے ہوئے لوگوں نے اپنے حکمرانوں کے بارے میں یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ وہ پیدا ہی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے ہوتے ہیں اور دوسرے

افراد پیدائشی طور پر ان کے غلام اور خدمت گزار ہیں۔اس تصوّر نے عام انسانوں کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا اور سختیوں میں پسے اور استبدادی نظام کے پنجوں میں جکڑے رہنے کے باوجود وہ یہ سمجھتے رہے کہ انہیں فرمانرواؤں کے خلاف لب کشائی کا کوئی حق نہیں ہے اور ان کا مقصد حیات ہی یہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے حکمرانوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان مہیا کریں اور ان کے شبستانوں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

جب سر زمین عرب پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اس وقت کے حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔کہ کمزور طاقتوروں کے سامنے بے بس تھے، غریب سُود خوروں کی گرفت میں اور غلام آقاؤں کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے اسلام نے ان جکڑے بندھے انسانوں کو حریت و مساوات کا ثمرہ سُنایا، رنگ و نسل کا امتیاز مٹایا، غلاموں کو انسانی حقوق سے بہرہ مند کیا اور انسانی حکومت کو ختم کر کے حکومت الٰہی کو قائم کر دیا، حکومت الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلےٰ کا اعتراف کیا جائے اور دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ سمو لیا جائے کہ وہی ہمارا اور سب کا مالک ہے وہ ہمارے ہر قول و فعل کو سننے اور دیکھنے والا ہے اور ہم اسی کے احکام کے پابند اور اسی کے سامنے جوابدہ ہیں۔اس حاکمیت کا اعتراف استبدادی بتوں کو پاش پاش کر کے دل و دماغ میں برادری و برابری کا احساس پیدا کرتا ہے اور انہیں تمام ناروا پابندیوں سے چھڑا کر فطری و طبعی آزادی کی راہ پر لے چلتا ہے۔

اس دوران رسول اکرم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے لیے اللہ نے اپنے گھر یعنی خانہ کعبہ کے اندر دنیا کو نور امامت سے منور فرمایا اور اُس ہستی نے آنکھ کھولی تو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش مبارک میں اور یوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم رسالت اور آغاز امامت کی خبر دے کر اسلام نے کفر و شرک اور نفاق کے خلاف اس عظیم تحریک میں شامل ہونے کا گویا اعلان کر دیا کہ جس کا آغاز حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ و سلم سر زمین حجاز میں شروع کر چکے تھے اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش مبارک میں پلنے والا وہ بچہ ہی تھا کہ جس نے بھرے مجمع میں آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور تبلیغ رسالت کے ہر مرحلے میں آپ کا ساتھ دینے کا عزم ظاہر کیا اور جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی آپ علیہ السلام کو اپنا وصی، وزیر اور جانشین مقرر فرمایا چنانچہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے عہد کو بخوبی نبھایا اور آپ کے بعد آپ کی اولاد نے کار رسالت کو آگے بڑھانے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی سیرت اور فضیلت کے بیان میں علم و حلم، شجاعت و دلیری، شفقت و رحمدلی اور انہی جیسی بے انتہا صفات کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور ان موضوعات پر نہ جانے اب تک کتنی ہی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں اور تا قیام قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن اس کے باوجود آپ کی شخصیت کے مکمل ادراک کا دعویٰ شاید ہی کوئی

کر سکے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث یوں بیان کی جاتی ہے کہ مجھے کسی نے نہیں پہچانا سوائے علی کے اور علی کو کسی نے نہیں پہچانا سوائے میرے۔

پس یوں امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر چلتے ہوئے ایک طرف علم کی سرپرستی سے نوع انسان کے کارواں کو آگے بڑھایا اور دوسری طرف عمل کے وہ روشن نمونے پیش کئے جو ہر منزل پر شمع راہ کا کام دیتے اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کرتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ آپ علیہ السلام کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی کی جائے، آپ علیہ السلام کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی جائے اور آپ علیہ السلام کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کی راہیں متعین کی جائیں اور مادہ پرست ذہنیت کی شکست اخلاقی و روحانی قدروں کے ارتقاء اور اسلامی تصوّرات کے احیاء کے لیے اس مصلح اعظم کی تابناک زندگی کے نقوش کو مشعل راہ بنایا جائے نیز ان کے اصول زندگی کی غیر متزلزل بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل و تعمیر کی جائے، معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے آپ علیہ السلام کی سیرت کو اپنایا جائے تاکہ انفرادی و اجتماعی زندگی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ اور اخلاقی رفعتوں سے ہمکنار ہو سکے۔

خلاصۃ حضرت علیؑ کی زندگی پہ نظر ڈالی جائے تو آپ علیہ السلام کی زندگی کے ہر پہلو میں عدالت ہی عدالت نظر آتی ہے، اسی لیے آپ علیہ السلام کو ''قتیل العدالت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ علی علیہ السلام کی عدالت کے ہر پہلو کو ایک مقالے میں سمویا نہیں جاسکتا، لہذا اس مقالے میں علی علیہ السلام کی نظر میں معاشرتی انصاف پر کچھ گفتگو کی گئی ہے۔

عدالت کی تعریف

لغت میں عدالت کی تعریف: کتاب صحاح میں جوہری نے عدل کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عدل جور کی ضد ہے، اور کہا جاتا ہے ''عدل بين المتخاصين: انصف بينهما وتجنب الظلم والجور، اعطى كل ذى حق حقه'' یہ جملہ '' عدل بين المتخاصين '' اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص باہمی جھگڑا کرنے والے دو اشخاص میں انصاف کرے، اور ان پر ظلم و ستم کرنے سے اجتناب کرے، ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کرے۔[1]

اور القاموس المحیط میں جو معنی بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: عدل جور کی ضد ہے، اسی طرح ہر وہ چیز جو سچائی اور حقیقت پر مبنی ہو اسے عدل کہا جاتا ہے، اس کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے عدالۃ و عدولۃ و معدِلہ و معدَلۃ۔[2]

عدل کا لفظ مصدر ہے اور یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے رجلٌ عدلٌ، رجلٌ عادلٌ و رجالٌ عدلٌ۔

المفردات فی غریب القرآن میں لکھا ہے: بدلہ لینے میں برابری اور مساوات سے کام لینے کو عدل کہا جاتا ہے، اگر اچھائی کی ہو تو اس کے بدلے میں اچھائی اور بُرائی کی ہو تو اس کے بدلے میں بُرائی۔(4)

ان تعریفوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عدالت لغت میں استقامت کے معنی میں آتی ہے اور عادل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی شبہ والا کام اور مشکوک عمل سرزد نہ ہوا ہو۔ یا عادل سے مراد ایسا شخص ہے کہ جس سے لوگ راضی ہوں اور اس کی گواہی تنازعات اور دیگر موارد شرعیہ میں قابل قبول ہو۔

اصطلاح میں عدالت کی تعریف: کتاب مفہوم عدالت صحابہ میں ابو عبداللہ الذھبی نے امام غزالی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ عدالت سے مراد سیرت اور دین میں استقامت ہے۔ یعنی کوئی شخص اپنے اندر تقویٰ اور پرہیز گاری کو اس طرح سے راسخ کرے کہ لوگ اس پر اعتماد کریں، لیکن یہ شرط نہیں ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم بھی ہو، البتہ صرف گناہان کبیرہ سے بچے رہنا کافی نہیں ہے بلکہ گناہان صغیرہ سے بھی بچے رہنا جیسے چوری کرنا، چاہے وہ ایک پیاز کی چوری ہی کیوں نہ ہو یا یک دانہ گندم یا چاول ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ بعض کے مطابق جائز کاموں سے بھی دوری ضروری ہے جیسے راستے میں کھڑے ہو کر کھانا کھانا، بہت زیادہ شوخی دکھانا وغیرہ۔(5)

عدالت سے مراد یہ ہے کہ انسان واجبات کو انجام دے اور حرام کاموں کو ترک کرے اس کو عدالت کہا جاتا ہے۔ اور عادل ہونے کی نشانی یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک اچھا شخص ہو اور اس کے اہل محلّہ ہمسائے یا ہم نشینوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا جائے تو وہ اس کی اچھائی کی تصدیق کریں۔(6)

گویا عدل و انصاف کے معنی ہیں ہر ایک انسان اور ذی روح سے یکساں اور مناسب سلوک کرنا، تمام لوگوں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا، امیر و غریب، گورے و کالے، عربی و عجمی، اور شاہ و گدا کی تمیز کو ختم کرنا۔ عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر اس طرح سے رکھا جائے جیسے رکھنے کا حق ہے۔

عدالت قرآن کی نظر میں

عدل و قسط جو ظلم و جور کی ضد ہیں، اسے قرآن نے بہت ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں لفظ "عدل" اپنے سارے مشتقات کے ساتھ 72 مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سورہ حجرات آیت 9 میں ارشاد فرماتا ہے: "فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ" پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

آیت اللہ جعفر سبحانی اپنی کتاب "قرآن کا دائمی منشور" میں لکھتے ہیں: کچھ لوگوں کی نظر میں بظاہر قسط و عدل دو مترادف الفاظ ہیں اور ان کا ایک ہی معنی ہے جس طرح ظلم و جور کے بھی ایک ہی معنی ہیں اور تاکید کے لیے اکٹھے لائے جاتے

ہیں مگر آیات قرآنی اور احادیث اسلامی اور عربی لغات کی طرف توجہ کرنے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ قسط لفظ عدل کے ساتھ آتا ہے، اس سے مراد قسط اقتصادی اور حقوق و اموال میں انصاف ہے۔ اگر چہ یہ قانون کلی نہ بھی کہا جاسکے تو اس کے اکثر معنی یہی ہوتے ہیں۔ (7)۔ اسی طرح سورہ ہود کی آیۃ 85 میں اللہ فرماتا ہے: ''وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ'' اور اے میری قوم! انصاف کے ساتھ پورا ناپا اور تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

اللہ تبارک و تعالیٰ سورہ نساء آیۃ 135 میں ارشاد فرماتا ہے ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا''

اے ایمان والو! انصاف کے سچے داعی بن جاؤ اور اللہ کے لیے گواہ بنو اگرچہ وہ تمہاری ذات یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی امیر یا فقیر ہے تو اللہ ان کا بہتر خیر خواہ ہے، لہٰذا تم خواہش نفس کی وجہ سے عدل نہ چھوڑو اور اگر تم نے کج بیانی سے کام لیا یا (گواہی دینے سے) پہلو تہی کی تو جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال سے یقیناً خوب باخبر ہے۔ آیت اللہ مکارم شیرازی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابن عباس سے منقول ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نو مسلم افراد مدینہ میں آجانے کے بعد بھی رشتہ داری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے عزیزوں کے نقصان میں گواہی دینے سے احتراز کرتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور اس کے ذریعے ایسے لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔ جیسا کہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ یہ کام روح ایمان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حقیقی مؤمن وہی ہے جو حق اور عدالت کے سامنے کسی کا لحاظ نہ کرے یہاں تک کہ اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے مفادات کی پرواہ بھی نہ کرے۔ اس جملے سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رشتہ دار ایک دوسرے کے نفع یا نقصان میں گواہی دے سکتے ہیں (ہاں البتہ اس میں تہمت کا اندیشہ نہ ہو کہ طرفداری یا تعصب سے کام لیا جا رہا ہے) (8)

اسی طرح سورہ مائدہ آیت 8 میں اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ'' اے ایمان والو! اللہ کے لیے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہاری بے انصافی کا سبب نہ بنے، (ہر حال میں) عدل کرو! یہی تقویٰ کے قریب ترین ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

پھر سورہ انعام آیت 152 میں ارشاد فرماتا ہے: ''وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ''

اور یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانا مگر ایسے طریقے سے جو (یتیم کے لیے) بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتے اور جب بات کرو تو عدل کے ساتھ اگرچہ وہ اپنے قریب ترین رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے اور اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرو، یہ وہ ہدایات ہیں جو اللہ نے تمہیں دی ہیں شاید تم یاد رکھو۔ سورہ اعراف آیت 29 میں قیام عدالت کے بارے میں خدا فرماتا ہے: ''قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ'' کہد یجئے: میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔

اسی طرح سورہ نحل آیت 90 میں عدل و احسان کرنے اور اپنے پڑوسیوں، ہمسایوں اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ فرماتا ہے: ''إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ . یقیناً اللہ عدل اور احسان اور قرابتداروں کو (ان کا حق) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت قبول کرو۔

عدل وہی قانون ہے جس کے گرد تمام نظام ہستی گردش کرتا ہے آسمان و زمین اور تمام موجودات عدالت کے ساتھ قائم ہیں۔ پس یہ معاشرہ عالم ہستی کے اس عمومی قانون سے الگ نہیں ہو سکتا اور عدل کے بغیر صحیح طرح اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا۔

عدالت سنت مبارکہ کی روشنی میں

عدل الٰہی کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے گناہ کبیرہ کیا ہو اور دنیا میں اس کو اسی کی سزا دے دی گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں دوبارہ سزا نہیں دے گا، خدا اس سے عادل تر ہے۔ (9)

عدل کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: عدل ایسی اساس ہے جس پر کائنات کا نظام قائم ہے۔ (10) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ایک گھڑی اور لمحہ کا عدل ستر سال کی عبادت سے افضل ہے جن میں راتوں کو نماز پڑھی جائے اور دن میں روزے رکھے جائیں اور فیصلہ کرنے میں ایک گھڑی کا ظلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساٹھ برس کے گناہوں سے بد تر ہے۔ (11)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں : عدل اس پانی سے زیادہ شیریں ہے جس سے پیاسا شخص اپنی پیاس بجھاتا ہے...۔" (12)۔ مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: یقیناً عدل اللہ تعالیٰ کا وہ ترازو ہے جسے اس نے مخلوق کے لیے مقرر فرمایا اور قیام حق کے لیے نصب فرمایا۔ لہٰذا اس ترازو کی مخالفت نہ کرو اور نہ ہی اس کے اقتدار کا مقابلہ کرو"۔(13)
امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں : عدل شہد سے زیادہ شیریں ، مکھن سے زیادہ نرم اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔(15،14)

مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: فضائل چار طرح کے ہیں، ان میں سے ایک عدالت ہے۔(16) اور آپ علیہ السلام کا دوسرا قول ہے: لوگوں میں سے سب سے بڑا عادل وہ ہے جو انتقام پر قادر ہونے کے باوجود انصاف سے کام لیتا ہے اور سب سے زیادہ بردبار وہ شخص ہے جو طاقت ور ہونے کے باوجود بُردباری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ (17)

علیؑ اور عدالت

امام علیہ السلام کے خطبوں اور خطوط اور اپنے اعمال نیز مددگاروں کو دی گئی ہدایات میں ہمیشہ رعایا کے ایک ایک فرد کے ساتھ عدل سے پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ مالک اشتر کے عہد نامے میں آیا ہے، تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیے جو حق کے اعتبار سے بہترین اور انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل کرے اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو، کیونکہ عوام کی ناراضگی خاص کی رضامندی کو بے اثر بنا دیتی ہے. اور خاص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جاسکتی ہے. اور یہ یاد رکھو! کہ رعیت میں خاص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں کہ جو خوش حالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کترا جانے والا، انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، طلب و سوال کے موقعہ پر پنجے جھاڑ کر پیچھا کرنے والا، بخشش پر کم شکر گزار ہونے والا، محروم کر دیئے جانے پر بمشکل عذر سننے والا اور زمانہ کی آزمائشوں پر بے صبری دکھانے والا، اور دین کا مضبوط سہارا مسلمانوں کی قوت اور دشمن کے مقابلے میں سامان دفاع یہی امت کے عوام ہوتے ہیں۔

اسی عہد نامہ کے ایک دوسرے حصے میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں: حکمرانوں کے لیے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل وانصاف برقرار رہے اور رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے اور ان کی محبت اسی وقت ظاہر ہوا کرتی ہے کہ جب ان کے دلوں میں میل نہ ہو اور ان کی خیر خواہی اسی صورت میں ثابت رہتی ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لیے گھیرے ڈالے رہیں. ان کا اقتدار بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمے کے لیے

گھڑیاں گنیں، لہذا ان کی امیدوں میں وسعت وکشائش رکھنا، انہیں اچھے لفظوں سے سراہتے رہنا اوران کے کارناموں کا تذکرہ کرتے رہنا اس لیے کہ ان کے اچھے کارناموں کا ذکر بہاروں کو جوش میں لے آتا ہے اور پست ہمتوں کو ابھارتا ہے.

علیؑ کی عدالت احادیث کی روشنی میں

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کائنات میں مولا علی علیہ السلام ہی حق طلب افراد کے پیشوااور عدالت خواہ لوگوں کے سربراہ اور عدل وانصاف کو نافذ کرنے کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، اسی لیے آپ علیہ السلام کو "شہید عدالت" کے نام سے یاد کیا ہے چنانچہ مسیحی دانشور اور ادیب "جارج جرداق" اپنی کتاب الامام علی علیہ السلام صوت العدالۃ الانسانیۃ میں لکھتا ہے: ''قُتِلَ علیٌّ فی محراب عبادتہ لشدّۃ عدلہ''

مولا علی علیہ السلام کو محراب عبادت میں اس لیے شہید کیا گیا کہ آپ علیہ السلام عدالت کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ کیونکہ مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا کی قسم مجھے سعدان (ایک خاردار جھاڑی ہے) کے کانٹوں پر جاگتے ہوئے رات گزارنا اور طوق وزنجیر میں مقیّد ہو کر گھسیٹا جانا اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو۔ یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو، میں اس نفس کی خاطر کیونکر کسی پر ظلم کر سکتا ہوں جو جلد ہی فنا کی طرف پلٹنے والا ہے اور مدتوں تک مٹی کے نیچے پڑا رہنے والا ہے۔(18)

عدالت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''علی اعدل الناس فی الرّعیّۃ''۔ لوگوں میں سے سب سے زیادہ عادل شخص علی ہے۔(19)

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''علی ابصر الناس بالقضیۃ''۔ علی قضاوت میں بابصیرت ترین شخص ہے۔(20)

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی عدالت اور رحم دلی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے قاتل کے بارے میں وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے عبد المطلب کے بیٹو! ایسا نہ ہونے پائے کہ تم لوگ، امیر المؤمنین قتل ہو گئے، امیر المؤمنین قتل ہو گئے کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کر دو۔ دیکھو! میرے بدلے میں صرف میرا قاتل ہی قتل کیا جائے اور دیکھو! جب میں اس ضرب سے مر جاؤں تو اس ایک ضرب کے بدلے میں اسے بھی ایک ہی ضرب لگانا اور اس شخص کے ہاتھ، پیر نہ کاٹنا کیونکہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خبر دار! کسی کے بھی ہاتھ، پیر نہ کاٹو اگرچہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔(21)

چھٹے امام حضرت جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں: حضرت علی علیہ السلام نے یمن میں ایک مرتبہ ایک معاملے کا فیصلہ کیا تو وہ لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: علی علیہ السلام نے ہمارے اوپر ظلم کیا ہے۔ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: علی علیہ السلام ظالم نہیں ہے اور نہ ہی اسے ظلم کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ بتحقیق علی علیہ السلام میرے بعد تمہارے ولی ہے۔ اور ان کا حکم میرا حکم ہے اُن کا قول میرا قول ہے، اُن کے حکم کو مسترد نہیں کرتا مگر کوئی کافر، اور اُن سے راضی نہیں ہوتا مگر مؤمن۔[22]

مولا علی علیہ السلام کی عدالت سے محبت کس قدر تھی؟ یہ بات خود مولا علی علیہ السلام کی اس حدیث سے ثابت ہو جاتی ہے: امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا گیا کہ عدالت بہتر ہے یا سخاوت؟ فرمایا: "عدالت ہر چیز کو ان کے موقع و محل پر رکھتی ہے اور سخاوت ان کو ان کی حدوں سے باہر کر دیتی ہے۔ عدالت سب کی نگہداشت کرنے والی شے ہے جب کہ سخاوت جس کے ساتھ کی جائے اسی سے مخصوص ہو گی۔ لہذا عدل سخاوت سے بہتر و برتر ہے۔[23، 24]

امام علیؑ کی حکومت میں عدالت اسلامی کا نفاذ

نفاذ عدالت: ابتدائے اسلام میں جب مسلمان دوسروں کی خلافت سے تنگ آگئے تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ علی علیہ السلام کی طرف دست نیاز دراز کریں اور ان سے استدعا کریں کہ حکومت اور خلافت کے امور اپنے ہاتھ میں لیں اور انہیں خود سنبھال لیں اور خود ہی چلائیں۔ جیسا کہ خود حضرت علی علیہ السلام کی نہج البلاغہ میں موجود فرمان کے مطابق لوگوں نے آپ علیہ السلام کے دروازے پر اس قدر ہجوم کیا اور اس قدر کثیر تعداد میں حاضر ہوئے کہ قریب تھا کہ حسن اور حسین علیہما السلام ان لوگوں کے پاؤں تلے روندے جائیں، ان لوگوں میں جہاں اور بھی بہت سے افراد تھے وہاں طلحہ اور زبیر بھی تھے جو خود اس خلافت کے متمنی تھے، مگر کچھ مصلحتوں کی بناء پر حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پس جس دن سے حکومت جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کے ہاتھ آئی تھی، آپؑ عدالت کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور کسی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپؑ کو ماورائے عدالت کسی سے خاص رعایت کرنے یا مسلمانوں کے اموال ہتھیانے اور ظلم و زیادتی کے بل بوتے پر حمایتی اکٹھا کرنے سے نفرت تھی۔

خود علی علیہ السلام نے ایک خطبے میں فرمایا: خدا کی قسم اگر مجھے سات آسمانوں کے نیچے جو کچھ بھی ہے اس کی ولایت دی جائے تاکہ میں ایک چیونٹی کے حق میں خدا کی نافرمانی کروں اور جَو کے چھلکے کو اس سے چھین لوں تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ یہ تمہاری دنیا میرے نزدیک اس پتے سے بھی پست تر ہے جسے ٹڈی اپنے منہ میں چباتی ہے پس علی کو ان فانی نعمتوں اور ختم ہونے والی لذّتوں سے کیا کام؟[25]

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہر، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے ذرائع مہیا کر سکتا تھا لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنا کر اور حرص مجھے اچھے کھانوں

کے چن لینے کی دعوت دے جب کہ حجاز اور یمامہ میں شاید ایسے لوگ بھی ہوں کہ جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو، کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہا کروں ؟ در حالانکہ میرے گرد وپیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں یا میں ویسا ہی ہو جاؤں جیسا کہنے والے نے کہا کہ "تمہاری یہ بیماری کیا کم ہے کہ تم پیٹ بھر کر لمبی تان لو اور تمہارے گرد ایسے جگر ہوں جو سوکھے چمڑے کو ترس رہے ہوں"۔ کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المؤمنین کہا جاتا ہے مگر میں زمانہ کی سختیوں میں مؤمنوں کا شریک و ہمدم اور زندگی کی بدمزگیوں میں ان کے لیے نمونہ نہ بنوں۔[26]

اس میں شک نہیں کہ وہ ہر شخص جو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہو، عدل کا مدعی ہے لیکن ان میں سے سچا کون ہے اسکا معیار کیا ہے؟ کون عدالت پسندی کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس کی بات حجت ہو؟ عدل کا سرچشمہ کہاں سے حاصل ہوتا ہے اس کی نمود انسان کے باطن سے ہے یا اس کے وجود کے باہر سے ؟

ان تمام سوالوں کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ عدل انسان کے باطن سے نمود حاصل کرتا ہے اور اسکا سرچشمہ صرف ایمان ہے اور دوسری شاخیں یا فرعیں اسی اصل سے نکلتی ہیں چنانچہ امام اس سلسلے میں اپنی خلافت کے اوائل میں اپنے خطبے کے دوران ایک مختصر اور جامع جملہ ارشاد فرماتے ہیں: خداوند عالم نے مسلمانوں کے مقررہ حقوق کو ان کے موقع اور محل پر اخلاص و توحید کے دامن سے باندھ دیا ہے۔[27]

حضرت علی علیہ السلام کا حکومت کرنے کا اصلی مقصد اور ہدف ہی یہ تھا کہ لوگوں کے درمیان حق وعدالت کے ساتھ کام لیا جائے۔ چنانچہ نہج البلاغہ خطبہ 33 میں ہے کہ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں مقام "ذی قار" میں مولا علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے جوتے کو خود گانٹھ لگا رہے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بول اُٹھے، "تمہارے نزدیک اس جوتے کی کیا قیمت ہو گی"؟ تو میں نے عرض کیا، مولا اس کی کیا قیمت ہو گی، یہ تو پھینک دینے کے قابل ہے یہ سن کر فرمایا: خدا کی قسم میرے نزدیک یہ جوتا تمہاری حکومت سے زیادہ محبوب ہے۔ "الّا ان اُقیم حقّاً او ادفع باطلاً"۔ میں نے حکومت تو صرف اس لیے لی ہے تاکہ اس کے ذریعے حق کو قائم کر سکوں اور باطل کو دور پھینک دوں۔

اسی مقام پر آپ علیہ السلام ہی ارشاد فرماتے ہیں: پروردگارا! تو بہتر جانتا ہے جو کچھ ہم انجام دے چکے ہیں، ہمارا اقدام اس لیے نہیں کہ ہم ملک اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیں اور نہ ہی اس لیے تھا کہ دنیا کے پست مال و متاع سے کچھ اکٹھا کر لیں بلکہ یہ سب کچھ اس لیے تھا تاکہ تیرے دین کی ختم ہو جانے والی نشانیوں کو دوبارہ ظاہر کریں، تیرے شہروں میں اصلاح کو آشکار کریں، تاکہ تیرے مظلوم بندے سکھ کا سانس لے سکیں اور جو قوانین معطل کئے جا چکے ہیں ان کا دوبارہ اجرا ہو۔[28]

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام حکومت کی تشکیل کا اصلی مقصد حق اور عدالت کے قیام پر منحصر سمجھتے ہیں، کیونکہ جب تک قانون عدل قائم نہ ہو مملکت کو چلانا ناممکن ہوتا ہے، آپ علیہ السلام کا دور حکومت دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اگر حکمرانوں کو دنیا سے افلاس و غربت لوٹ مار، کرپشن، دہشت گردی اور دیگر تمام مسائل کا حل چاہیے تو وہ علی علیہ السلام کے طرز حکومت کا مطالعہ کریں کیونکہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھی اور آج دنیا عدل وانصاف کے اوپر مفادات کو ترجیح دیتی ہے۔ پس اگر حکمران اپنی ترجیحات میں عدل علی علیہ السلام کو شامل کریں تو پوری دنیا سے ظلم وجبر کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

میدان تاریخ میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام وہ واحد سیاستدان ہیں کہ جن کی حکومت کی بنیاد عدالت پر قائم تھی یہ حکومت اگرچہ مختصر تھی لیکن رہتی دنیا تک کے لیے نمونہ تھی۔

یقیناً امیر المؤمنین وہ واحد ہستی ہیں کہ جنہوں نے عدالت کی راہ میں جام شہادت نوش فرمایا اور آپ علیہ السلام کے سخت سے سخت دشمن تک کو یہ کہنا پڑا ''قُتِلَ عَلِیٌّ لِشِدَّةِ عَدْلِہِ'' یعنی علی علیہ السلام شدت عدالت کی وجہ سے شہید ہوئے۔

محکمہ قضاء: حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ رعایا کے نزاعی امور کا بے لاگ فیصلہ کرنے کے لیے ایسی عدالتیں قائم کرے جہاں ہر ادنیٰ واعلیٰ اور امیر و غریب کو حصول انصاف کا یکساں موقع میسر ہو۔ تاکہ کمزور کی حق تلفی نہ ہونے پائے اور مظلوم دادرسی سے محروم نہ رہے۔ اگر کمزور افراد اور پسے ہوئے طبقے کو حکومت کی طرف سے یہ تحفظ نہ ہو تو نہ اجتماعی نظم باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے بلکہ کمزور افراد یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں ظلم کے خلاف فریاد سننے والا اور ظالم کے پنجہ استبداد سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہے۔ اس سے ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی ہوگی اور دوسری طرف کمزور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ظلم وجور سہتے رہیں گے اور آخر اندرونی گھٹن انہیں آمادہ بغاوت کرے گی اور بغاوت کا آتش فشاں پھٹتا ہے تو حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم۔ کفر کے ساتھ ملک باقی رہ سکتا ہے اور ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔

دنیا کی آئینی حکومتیں عدل وانصاف کو بروئے کار لانے کے لیے دیوانی و فوجداری کے نام سے عدالتیں تو قائم کرتی ہیں مگر وہاں حصول انصاف کے لیے عدالتوں کے چکّر لگانے پیشیاں بھگتنے وکیل کرنے اور کورٹ فیسوں کا بار اُٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر اسلام نے محکمہ قضا کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اگر اس کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط ملحوظ رکھے جائیں تو نہ انصاف کے حصول میں دشواری پیش آسکتی ہے اور نہ مالی اعتبار سے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ نہ اس میں اقربا پروری کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ رشوت کی گنجائش ہے اس لیے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس منصب پر وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو تقوی وعدل سے آراستہ اور اسلامی قوانین پر اجتہادی نظر رکھتے ہوں۔ خود داری اور عزت نفس انہیں عزیز ہو اور وہ معاشرہ

میں معزز و باوقار ہوں تاکہ رشوت ستانی سے اپنے دامن کو داغدار نہ ہونے دیں اور کسی دولتمند سے مرعوب و متاثر ہو کر عدل وانصاف سے انحراف نہ کریں۔

مولا علی علیہ السلام نے اپنے دور خلافت میں محکمہ قضا کو خاص اہمیت دی اور ہر مرکزی مقام پر اس کا شعبہ قائم کیا اور انہی لوگوں کو منصب قضا کے لیے نامزد فرمایا جو تقویٰ و دیانت اور علمی اہلیت کے لحاظ سے اسلام کے مقرر کردہ معیار پر پُورے اُترتے تھے حضرت خود بھی پیغمبر اکرمؐ کے دور میں منصب قضا پر فائز رہے تھے اور اپنی انصاف پروری اور معاملہ فہمی کا سکہ دلوں پر بٹھا چکے تھے۔ اس عملی تجربہ کے بعد ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ محکمہ قضا کن خطوط پر قائم ہونا چاہیے حکام عدلیہ کے فرائض کیا ہیں اور کس نہج پر انہیں تربیت دینا چاہئے کہ وہ رشوت سفارش اور اقرباپروری سے بچ کر انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ جنہوں نے انسان کی طبعی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کا پورا لحاظ رکھا کہ قضاۃ کو اتنا وظیفہ ملنا چاہئے کہ وہ رشوت اور ناجائز آمدنی سے بے نیاز ہو کر آسودگی و خوش اسلوبی سے گزر بسر کر سکیں اور ضرورت واحتیاج انہیں غلط راہ پر نہ ڈال دے۔ مزید اطمینان کے لیے آپ ان کی مالی حالت اور معیار زندگی پر نظر رکھتے املاک و جائیداد کا جائزہ لیتے اور آمد و خرچ کا موازنہ کرتے اور اگر صورت حال مشتبہ نظر آتی تو تنبیہ و سرزنش کرتے یا برطرف کر دیتے۔ چنانچہ قاضی کوفہ شریح ابن حارث کے بارے میں ہے کہ وہ حضرت عمر کے دور سے عہدہ قضا پر فائز تھا، اس کی بابت یہ معلوم ہوا کہ اس نے 80 دینار میں ایک مکان خرید لیا ہے، حضرت نے اسے طلب کیا اور فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک مکان 80 دینار میں خریدا ہے شریح نے کہا کہ جی ہاں ایسا ہی ہے۔ تب حضرت نے اسے غصّہ کی نظر سے دیکھا اور کہا "اے شریح کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے اس گھر کو کسی دوسرے کے مال سے خریدا ہو یا حرام کی کمائی سے قیمت ادا کی ہو پس اگر ایسا ہے تو تم نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔"(29)

بنیادی حقوق کا تحفّظ: انسان جب شعور کی دنیا میں قدم رکھتا ہے ایک طرف تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ محسوس کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس میں کچھ معاشرتی حقوق بھی رکھتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے فرائض کو پہچانے اور اپنے حقوق کا تحفّظ کرے خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اور اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق کو بھی پامالی سے بچائے اور اگر ان حقوق کی ادائیگی میں کوئی امر رکاوٹ بن جائے تو وہ بقدر امکان انہیں دور کرنے کی کوشش کرے تاکہ ناجائز پابندیوں اور ناروا بندشوں کو توڑ کر اپنی فطری آزادی بحال رکھ سکے۔ ان حقوق کے تحفّظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

امیر المؤمنین جہاں انسانی اقدار کے محافظ تھے وہاں انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ تھے اور کسی صورت میں جانی نقصان اور خون ناحق کے ضیاع کو گوارا نہ کرتے تھے۔ اگرچہ آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جنگوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنے عہد میں بھی خونی جنگیں لڑیں مگر ان میں سے ہر جنگ دفاعی نوعیت کی

تھی۔آپ علیہ السلام جہاں ناحق خون ریزی کے شدید مخالف تھے وہاں یہ بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کسی کا خون رائیگاں جائے اور قاتل قصاص سے بچے رہیں۔ چنانچہ جب حضرت عمر قتل کر دیئے گئے تو ان کے فرزند عبید اللہ نے ہرمزان اور چند بے گناہوں کو قتل کر دیا۔ حضرت عثمان نے اس سے چشم پوشی کی اور اسے قتل کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن جب امیر المؤمنین نے زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لی تو اسے قصاص میں قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ اموی شخصیات کے دامن مین پناہ لینے کے لیے شام بھاگ گیا۔ جیسا کہ ابن اثیر نے تحریر کیا ہے: جب حضرت علی علیہ السلام خلافت پر فائز ہوئے تو عبید اللہ کے قتل کا ارادہ کیا مگر وہ بھاگ کر معاویہ کے پاس شام چلا گیا۔ اور آخر صفین میں امیر المؤمنین کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ (30)

معاشی نظام: موجودہ دور میں معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت کے گرد ہی گھومتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسا آزاد معاشی نظام ہے جس میں ہر شخص کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ تمام مذہبی اخلاقی اور رسمی قیود کو نظر انداز کر کے جس قدر دولت سمیٹ سکتا ہے سمیٹے۔ نہ اس کے جمع کرنے میں کوئی اخلاقی رکاوٹ ہے نہ سماجی بندش۔ یعنی اس نظام میں اجتماعی مفاد پر شخصی مفاد کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور سرمایہ دار کی نظر ذاتی منفعت اور حصول زر پر مرکوز رہتی ہے۔ یہ ہوس اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سرمایہ دار مفاد عامہ کو کچل کر اور دوسروں کے مفاد کو ٹھکرا کر خود غرضی و مفاد پرستی کی راہ اختیار کرتے اور دولت کی جمع آوری ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیتے ہیں ایسے میں نہ کسی پر ظلم ڈھانے سے ان کا ہاتھ رُکتا ہے اور نہ کسی کا خون چُوسنے سے ان کا دل پسیجتا ہے۔ ان سرمایہ داروں کی بے راہ روی اور ناانصافی کے نتیجہ میں محنت کش طبقہ کے دلوں میں نفرت کے جذبات کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ مزدور یہ سمجھتا ہے کہ وہ سرمایہ جو نفع کی صورت میں بچ بچا کر سرمایہ دار کی جیب میں چلا جاتا ہے وہ اس کی محنت کا ثمرہ ہے۔ جبکہ سرمایہ دار یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی سُوجھ بوجھ اور سرمایہ کاری کا کرشمہ ہے اور مزدور اس کی مشینری کا ایک پُرزہ ہے جسے ناکارہ زنگ آلودہ ہونے کی صورت میں الگ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام نہ اس حد تک سرمایہ داری کا حامی ہے کہ کچھ لوگوں کو دولت پر اجارہ داری دے دے اور دوسروں کو اُن کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دے اور نہ اس حد تک مخالف ہے کہ اپنی پیدا کردہ املاک پر حق ملکیت نہ دے۔ بلکہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال اور حقیقت پسندی پر نظام معیشت قائم کیا گیا ہے۔ اس نظام میں نہ بے مہار سرمایہ داری ہے جو مذہبی و اخلاقی قیود سے آزاد ہوتی ہے اور نہ اشتراکیت ہے جو انسان کے جائز حق ملکیت کو سلب کر کے اس کی محنت کو روٹی اور کپڑے کے عوض خرید لیتی ہے اور ایک خاص طبقہ اس کی کمائی کو اپنی صوابدید سے خرچ کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ سرمایہ داری کی پشت پناہی کی ہے کہ ایک غیر عادلانہ طبقاتی نظام ظہور میں آئے اور معاشرہ غیر متوازن ہو کر رہ جائے اور نہ غیر فطری مساوات کی تعلیم دی ہے کہ حکومت تمام پیداواری وسائل کو اپنی تحویل میں لے کر قومی ملکیت قرار دے اور تمام افراد کی ضروریات کی یکساں طور پر کفیل ہو جائے۔ اس جبری مساوات سے کار کردگی کا جذبہ مضمحل اور سعی و

طلب کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے کیونکہ ذاتی کام اور اجتماعی کام میں تفریق کئے بغیر کاروکسب میں یکساں دلچسپی لینا انسانی تقاضائے طبیعت کے خلاف ہے اور اس کا اثر جلد یا بدیر معاشرہ کی مجموعی پیداوار پر پڑنا بھی ناگزیر ہے۔ اسلام نے اس جبری و غیر فطری مساوات کی بجائے ذرائع معیشت میں مساوات رکھی ہے اور ہر شخص کے لیے یکساں معاشی مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ ہر فرد اپنی جدوجہد اور استعداد کار سے معیشت کا سروسامان کرے اور اپنی محنت و کاوش کے مطابق ثمرہ و نتیجہ حاصل کرے چنانچہ قرآن مجید میں خداوند متعال فرماتا ہے: ''لیس للانسان الا ما سعٰی'' انسان کو اپنی محنت ہی کا ثمرہ ملتا ہے۔

بیت المال کی تقسیم: امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے جب بیت المال کے نظام کو اپنے ذمہ لیا تو عملِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق جس شہر میں جو مال جمع ہوتا اسے اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتے اور اگر وہاں سے کچھ بچ کر آتا تو بیت المال میں سمیٹ کر رکھنے کی بجائے ہر جمعہ کو مستحقین میں تقسیم کر کے بیت المال کو خالی کر دیتے۔ اور جب بیت المال خالی ہو جاتا تو اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتے دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں جس طرح خالی ہاتھ اندر داخل ہوا تھا اسی طرح خالی ہاتھ باہر جا رہا ہوں۔ ایک دفعہ رات کو اندھیرا چھا جانے کے بعد مال آیا تو مولا نے فرمایا کہ اس مال کو ابھی تقسیم کر دیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو رات ہو چکی ہے اسے کل کے لیے اُٹھا رکھئے۔ فرمایا کیا تمہیں یقین ہے کہ میں کل تک زندہ رہوں گا۔ اور پھر فرمایا کہ موت کا علم اللہ کے سوا کس کو ہو سکتا ہے۔ نیز فرمایا کہ پھر دیر نہ کرو اور اسے ابھی تقسیم کر دو چنانچہ چراغ روشن کئے گئے اور سارا مال راتوں رات تقسیم کر دیا گیا۔

محمد بن ابراہیم نافلی سے نقل ہوا ہے کہ جعفر بن محمد نے اپنے اجداد علیہم السلام سے نقل کیا ہے: کہ علی علیہ السلام نے اپنے خادمین سے فرمایا: "اپنے قلموں سے باریک اور سطریں ملا کر لکھیں، زیادہ فاصلہ نہ رکھیں اور میرے لیے زیادہ تعریفیں نہ لکھیں عبارات مختصر تحریر کریں اور کشادہ روی سے پرہیز کریں، کیونکہ مسلمانوں کا مال ضائع اور اسراف کرنے کے لیے نہیں ہے۔ [(31)]

محمد بن مسلم امام جعفر الصادق علیہ السلام سے روایت کرتا ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: جب امیر المؤمنین علی علیہ السلام خلافت ظاہری کے منصب پر فائز ہوئے اور منبر پر تشریف لے گئے تو اللہ کی حمد و ثنا کے بعد آپ علیہ السلام نے فرمایا خدا کی قسم! جب تک میں مدینے میں کھجور کی ٹہنی کا بھی مالک ہوں تو ایک درہم بھی تمہارے مالِ غنیمت سے کم نہیں کروں گا اور تم اس بات پر یقین کر لو آیا تم یہ سوچتے ہو کہ میں اپنے لیے نہیں رکھتا اور تمہیں دے دیتا ہوں؟ اس دوران عقیل کھڑے ہو کر کہتے ہیں: آپ خدا کی قسم! مجھ اور اُس سیاہ غلام کو برابر کر رہے ہیں جو مدینے میں رہتا ہے؟ علی علیہ السلام نے فرمایا: بیٹھ جاؤ تمہارے علاوہ کوئی اور یہاں پر گفتگو کرنے والا نہیں تھا؟ تم اس سیاہ غلام پر کیا برتری رکھتے ہو؟ مگر یہ کہ تم متقی اور پرہیز گار زیادہ ہو۔ [(32)]

اصبغ بن نباتہ نے کہا: امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی شخصیت ایسی تھی کہ جس وقت ان کے پاس مال لایا جاتا اس مال کو بیت المال میں رکھ دیتے اور اسی وقت حاجت مندوں کو پہنچا دیتے اور اسکے بعد اپنے ہاتھوں کو اموال میں ڈال کر اِدھر اُدھر بکھیر دیتے اور فرماتے تھے اے سونا اے چاندی مجھے فریب نہ دو، کسی اور کو دھوکہ دو! (یہ میرے ہاتھ کا چُنا ہوا ہے اور چننے والے کا ہاتھ اس کے منہ کی طرف بلند ہے) اس وقت تک بیت المال سے باہر نہیں آتے تھے جب تک اسے تقسیم نہ کریں اور ہر ایک کو اس کا حق دیا کرتے تھے اس کے بعد فرماتے تھے کہ بیت المال کو جھاڑو دے کر پانی سے دھو دیں اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور سلام پھیرنے کے بعد دنیا کو تین طلاق دے کر فرماتے تھے: اے دنیا میرے پیچھے مت آ، اور مجھے اپنا مشتاق نہ بنا اور فریب نہ دے میں نے تجھ کو تین طلاقیں دے دی ہیں اور کبھی بھی رُجوع نہیں کروں گا۔(34)

ایک رات کو مولا علی علیہ السلام بیت المال میں اموال کی تقسیم میں مشغول تھے کہ اچانک طلحہ اور زبیر امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو امام نے جو چراغ جلایا ہوا تھا اُسے بجھا دیا اور حکم فرمایا کہ دوسرا چراغ لایا جائے، اور اُسے جلایا۔ تو اُن دونوں نے وجہ پوچھی تو امام علیہ السلام نے فرمایا یہ چراغ بیت المال کا ہے اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی روشنی کے نیچے آپ لوگوں کے ساتھ اپنی ذاتی باتیں کروں۔(35)

خود مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: بخدا میں نے اپنے بھائی عقیل کو سخت فقر وفاقہ کی حالت میں دیکھا، یہاں تک کہ وہ تمہارے (حصے کے) گیہوں میں سے ایک صاع مجھ سے مانگتے تھے اور میں نے اُن کے بچوں کو بھی دیکھا جن کے بال بکھرے ہوئے تھے اور فقر و بے نوائی سے رنگ تیرگی مائل ہو چکے تھے گویا اُن کے چہرے نیل چھڑک کر سیاہ کر دیئے گئے ہوں، وہ اصرار کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور اس بات کو بار بار دہرایا تب میں نے ان کی باتوں کو کان لگا کر سنا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ میں ان کے ہاتھ اپنا دین بیچ ڈالوں گا اور اپنی روش چھوڑ کر ان کی کھینچ تان پر اُن کے پیچھے ہو جاؤں گا مگر میں نے یہ کیا کہ ایک لوہے کے ٹکڑے کو تپایا اور پھر اُن کے جسم کے قریب لے گیا تاکہ عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ اس طرح چیخے جس طرح کوئی بیمار درد و کرب سے چیختا ہے اور قریب تھا کہ ان کا بدن اس داغ دینے سے جل جائے پھر میں نے اُن سے کہا اے عقیل! (بغیر جلانے کی نیت کے) تپایا ہے اور تم مجھے اُس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو کہ جسے خدائے قہار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے۔ پس کیا ممکن ہے کہ تم تو اذیت سے چیخو اور میں جہنم کے شعلوں سے نہ چلاؤں۔(36)

قیام عدل کا نتیجہ

عدالت تمام انسانی معاشروں کی ایک ضرورت ہے۔ یہ ضرورت آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ عدالت وہ مشترک عنصر ہے جس پر سب جمع ہو کر کام کر سکتے ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی, اس لیے کہ عدالت لوگوں کے لیے وسعت اور کشائش کا باعث ہوتی ہے۔

حکومت عدل میں ظالم لوگ بھی بہتر انداز میں زندگی گزار سکتے ہیں کیونکہ ظلم و ستم کا دور دورہ ہو تو ایسی صورت میں ظالم ظلم و تعدی کرتا ہے اور ہمیشہ مظلوموں کے درپے رہتا ہے، اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ایک دوسرے سے جدائی اور باہمی کینہ و بغض ہوتا ہے ایسے میں لوگ ہمیشہ ظالموں کی طرف دشمنی اور نفرت سے نگاہ کرتے ہیں اور انتقام لینے کے لیے مناسب موقع کے منتظر رہتے ہیں، اور اگر انہیں انتقام لینے کا موقع نہیں ملتا تو اُن کی اولاد یا بعد میں آنے والی نسلیں، ظالموں کی اولاد اور پسماندگان سے انتقام لیتی ہیں۔

فطری سی بات ہے کہ عقیدہ ظلم بالآخر کھلتا ہے اور حالات کی تبدیلی و انقلاب کے باعث لوگ ظالموں سے ان کے مظالم کا حساب چکاتے ہیں۔ پس اگر عدل و عدالت کی حکمرانی ہو اور ہر حقدار کو اُس کا حق دیا جائے تو تمام افراد معاشرہ باہمی صدق و صفا اور محبت و آشتی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جو شخص عدالت سے تنگی و گھٹن محسوس کرتا ہو، تو حکومتِ ظلم و جور سے اس کی تنگی اور گھٹن فزوں ہوتی ہے۔ عدالت کی وجہ سے ہی معاشرہ میں امن و آشتی کی فضا قائم ہوتی ہے، ملک ترقی کرتا ہے، معاشرہ میں استحکام پیدا ہوتا ہے، بستیاں آباد ہوتی ہیں، جبکہ ظلم و ناانصافی سے بستیاں ویران، معاشرہ برباد، اور ترقی رک جاتی ہے۔ امام علیؑ عدل و انصاف کے پیکر تھے آپؑ نے موت کو قبول کیا لیکن ایک لمحہ کے لیے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اُس امام عادل کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے اپنی زندگی میں عدالت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

حوالہ جات

1. الصحاح تاج اللغۃ و صحاح العربیۃ، جوہری، ابی نصر اسماعیل بن حماد، طبعۃ الاولی 1420ھ، ناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان۔
2. القاموس المحیط، مجد الدین محمد فیروز آبادی، طبعۃ الاولی 1412ھ، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔
3. مفردات قرآن، راغب اصفہانی، ترجمہ و حواشی: محمد عبد اللہ الفلاح فیروز پوری، ناشر: المکتبۃ القاسمیہ لاہور۔
4. حوالہ سابق۔
5. عدالت صحابہ، ابو عبد اللہ الذہبی، ویب سائٹ: www.aqeedeh.com۔
6. توضیح المسائل، سید علی سیستانی، طبع دسمبر 2006ء، ناشر: جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان۔
7. قرآن کا دائمی منشور، جعفر سبحانی، مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی، سال اشاعت فروری 2010، ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

8. تفسیر نمونہ، ناصر مکارم شیرازی، مترجم: سید صفدر حسین نجفی، ایڈیشن اول، ج2 ص245۔
9. مسند احمد ابن حنبل و بہامشہ منتخب کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، ناشر: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع۔
10. بحار الانوار، علامہ مجلسی، طبعۃ الثالثۃ 1403ھ، ج78 ، ص83، مؤسسہ الوفاء، بیروت، لبنان۔
11. حوالہ سابق۔
12. بحار الانوار، علامہ مجلسی، طبعۃ الثالثۃ 1403ھ، ج78، ص36، مؤسسہ الوفاء، بیروت، لبنان۔
13. گفتار امیر المؤمنین، اُردو ترجمہ غرر الحکم، سید حسین، مترجم: نثار احمد زین پوری، ج2 ، ص91۔
14. اصول کافی، الکلینی الرازی ابی جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق، چاپ پنجم 1363ھ، ناشر: دار الکتب الاسلامیہ تہران۔
15. بحار الانوار، علامہ مجلسی، طبعۃ الثالثۃ 1403ھ، ج57 ص39، مؤسسہ الوفاء، بیروت، لبنان۔
16. حوالہ سابق، ج78 ص18، مؤسسہ الوفاء، بیروت، لبنان۔
17. گفتار امیر المؤمنین، اُردو ترجمہ غرر الحکم، سید حسین، مترجم: نثار احمد زین پوری، ج2 ، ص92۔
18. نہج البلاغہ موضوعاتی اُردو، علی انصاریان، مترجم: مفتی جعفر حسین، ناشر: امامیہ پبلی کیشنز پاکستان، خطبہ 221 ص468 طبع اول فروری 2012ء۔
19. احقاق الحق وازھاق الباطل، القاضی سید نور اللہ الحسینی، ناشر: مکتبہ آیۃ اللہ العظمیٰ المرعشی النجفی، قم ایران۔
20. حوالہ سابق۔
21. نہج البلاغہ موضوعاتی اُردو، علی انصاریان، مترجم: مفتی جعفر حسین، ناشر: امامیہ پبلی کیشنز پاکستان، ص295 اشاعت اول جون 2003ء۔
22. آثار الصادقین، حاج احسان بخش، چاپ اول۔
23. بحار الانوار، علامہ مجلسی، طبعۃ الثالثۃ 1403ھ، ج75، ص350، مؤسسہ الوفاء، بیروت، لبنان۔
24. شرح نہج البلاغہ لابن الحدید تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم، ناشر: دار الکتب العربیہ، طبعۃ الثانیہ 1387ھ، ج20، ص85۔
25. سفینۃ البحار، شیخ عباس قمی، طبعۃ الثالثۃ 1422ھ، مطبعۃ القرآن الکریم الکبریٰ۔
26. نہج البلاغہ موضوعاتی اُردو، علی انصاریان، مترجم: مفتی جعفر حسین، ناشر: امامیہ پبلی کیشنز پاکستان، ص294، اشاعت اول جون، 2003ء۔
27. حوالہ سابق، خطبہ 165، ص336۔
28. حوالہ سابق، خطبہ 33، ص120۔
29. سیرت امیر المؤمنین، مفتی جعفر حسین، ناشر: امامیہ کتب خانہ موچی دروازہ لاہور۔
30. الکامل فی التاریخ، لابن اثیر، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔
31. الخصال، شیخ صدوق، ناشر: جامعۃ المدرسین فی الحوزۃ العلمیۃ قم المقدسہ، ایران۔
32. روضۃ الکافی، ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی، ج8 ص129۔

33. تہذیب الاحکام فی شرح المقنعۃ، شیخ الطائفہ ابی جعفر محمد بن الحسن الطوسی، ناشر: دار الکتب الاسلامیۃ، تہران، چاپ سوم 1364ھ۔
34. ترتیب الامالی، محمد جواد المحمودی، ناشر: مؤسسۃ المعارف الاسلامیۃ، قم ایران، طبعۃ الاولی 1420ھ۔
35. آثار الصادقین، حاج احسان بخش، چاپ اول، ج14۔
36. نہج البلاغہ موضوعاتی اُردو، علی انصاریان، مترجم: مفتی جعفر حسین، ناشر: امامیہ پبلی کیشنز پاکستان، خطبہ 221، ص468۔
37. المفردات فی غریب القرآن، ابی القاسم الحسین بن محمد المعروف بالراغب اصفہانی، تحقیق وضبط: محمد خلیل، ناشر: مکتبۃ الصدیقیہ، سوات۔
38. لسان العرب، ابن منظور، ج9، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت۔
39. ایمان مجسم علی بن ابی طالب، محمد علی فاضل، اشاعت: جولائی 2010ء، ناشر: مکتبۃ الہادی، جامعۃ الکوثر، اسلام آباد۔
40. میزان الحکمت، محمد ری شہری، مترجم: مولانا محمد علی فاضل، ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

ششماہی علمی و تحقیقی مجلہ

الکوثر

AL KAUTHAR

رجب المرجب تا ذی الحجۃ 1442 ہجری قمری

مقام اشاعت: جامعۃ الکوثر H-8/2 اسلام آباد

http://alkauthar.edu.pk/

Contact : 0345-5143405